وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِ يَنَّهُمْ سُبُلَنَا ط

مِنہاج الطّالِبین

تقاریر

حضرت امیر المومنین مرزا بشیر الدین محمود احمد خلیفۃ المسیح الثانیؓ

شائع کردہ

نظارت نشرواشاعت قادیان

نام کتاب	:	منہاج الطالبین
مصنف	:	حضرت خلیفۃ المسیح الثانی رضی اللہ عنہ
سابقہ ایڈیشنز	:	دسمبر 2007ء، 2011ء
حالیہ طباعت	:	جنوری 2016ء
تعداد	:	1000
شائع کردہ	:	نظارت نشر و اشاعت قادیان، ضلع: گورداسپور صوبہ: پنجاب، انڈیا-143516
مطبع	:	فضل عمر پرنٹنگ پریس ہرچووال روڈ قادیان

ISBN: 81-7912-164-X

Minhajut Talibeen
by
Hadhrat Mirza Bashiruddin Mahmood Ahmad[ra]
Khalifatul Masih II

پیش لفظ

سیدنا حضرت مرزا بشیر الدین محمود احمد صاحب خلیفۃ المسیح الثانی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بارہ میں آپؓ کی پیدائش سے قبل ہی اللہ تعالیٰ نے سیدنا حضرت مسیح موعود علیہ السلام کو یہ خوشخبری دی تھی کہ وہ ''**علوم ظاہری و باطنی سے پُر کیا جائے گا**۔'' علوم ظاہری و باطنی سے پُر اس وجود کی تحریرات اور تقاریر نے جماعت کی روحانی ترقی اور تزکیۂ نفوس میں بھرپور کردار ادا کیا۔ جو رُشد و ھدایت کا ایک ایسا قیمتی خزانہ ہے جس کی افادیت اور عظمت دائمی حیثیت رکھتی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے آپؓ کو تحریرات اور تقاریر کا حیرت انگیز ملکہ عطا فرمایا تھا۔ جب آپ تقریر کرنے کے لئے کھڑے ہوتے تو سامعین ہمہ تن گوش ہو جاتے اور آپ کی زبان سے نکلا ہوا ایک ایک جملہ میخ کی طرح لوگوں کے دل و دماغ میں گڑ جاتا۔

آپؓ کی ایسی ہی عظیم الشان تقاریر میں سے کتاب ''منہاج الطالبین'' جو جلسہ سالانہ قادیان 1925ء کی دو تقاریر پر مشتمل ہے شائع کی جا رہی ہے۔ اس کتاب میں حضور انورؓ نے نہایت سادہ اور عام فہم انداز میں وہ طریق بتائے ہیں جن سے انسان گناہوں سے پاک ہو سکتا ہے۔ اور نیکیوں کی راہ پر چل پڑتا ہے۔

قبل ازیں یہ کتاب دفتر وقف نو نظارت تعلیم قادیان نے شائع کی تھی۔ کتاب کی ضرورت اور افادیت کے پیش نظر نظارت نشر و اشاعت اسے شائع کر رہی ہے۔ اللہ تعالیٰ ہر احمدی کو اس کتاب سے استفادہ کرنے کی توفیق دے۔ آمین

خاکسار

حافظ مخدوم شریف

ناظر نشر و اشاعت قادیان

بسم اللہ الرحمن الرحیم
نحمدہ ونصلی علی رسولہ الکریم وعلی عبدہ المسیح الموعود

مقدمہ

یہ کتاب منہاج الطالبین سیدنا حضرت امیر المومنین مرزا بشیر الدین محمود احمد خلیفۃ المسیح الثانی امام جماعت احمدیہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی دو تقریروں کا مجموعہ ہے جو آپ نے بتاریخ ۲۷، ۲۸ / دسمبر ۱۹۲۵ء جماعت احمدیہ کے جلسہ سالانہ پر قادیان میں ارشاد فرمائیں۔ اس کا پہلا ایڈیشن بک ڈپو تالیف و اشاعت قادیان کی طرف سے دسمبر ۱۹۲۶ء میں شائع ہوا۔ اس کا دوسرا ایڈیشن الشرکۃ الاسلامیہ لیمیٹڈ ربوہ نے ۱۹۵۶ء میں شائع کیا تھا۔ اور اسکا تیسرا ایڈیشن ۱۹۷۹ء میں ربوہ سے۔ اب اس کا چوتھا ایڈیشن ۲۰۰۶ء میں دفتر وقف نو نظارت تعلیم قادیان سے شائع ہو رہا ہے۔

اس کتاب کے ابتدائی ۲۱ صفحات تاریخ احمدیت کے اوراق ہیں اور اس کے بعد کا صفحہ اس اہم سوال کے جواب پر مشتمل ہے کہ ”وہ کون سے ذرائع ہیں جن پر عمل کر کے انسان گناہوں سے پاک ہو جائے۔ اور نفس میں نیکیاں پیدا ہو جائیں۔“ پس یہ کتاب علم تصوف کا ایک بہترین شاہکار ہے جس میں تربیت اولاد کے طریق بھی بیان کئے گئے ہیں۔ اس لئے ہر احمدی گھرانہ میں اس سے استفادہ کرنے کے لئے اس کا موجود ہونا ضروری ہے تا وہ اپنے آپ کو اور اپنی اولاد کو **قد افلح من زکّٰھا** کا مصداق بنا سکیں۔

یہ کتاب نصاب وقف نو میں شامل ہے۔ جملہ والدین واقفین نو سیکرٹریان وقف نو مبلغین و معلمین کرام اس کو خود بھی پڑھیں اور بچوں کو بھی پڑھائیں۔

اللہ تعالیٰ آپ سب کو احسن رنگ میں واقفین نو کی تربیت کی توفیق عطا کرے۔ آمین

والسلام

خاکسار

مرزا وسیم احمد

چیئر مین وقف نو کمیٹی بھارت

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حضرت خلیفۃ المسیح ثانی رضی اللہ عنہ کی تقریر

فرمودہ ۲۷؍دسمبر ۱۹۲۵ء کو برموقعہ جلسہ سالانہ

حضور نے تشہد اور تعوذ کے بعد حسب ذیل آیات تلاوت فرمائیں:-

اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّیْلِ وَ النَّھَارِ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی الْاَلْبَابِ. الَّذِیْنَ یَذْکُرُوْنَ اللّٰہَ قِیَامًا وَّ قُعُوْداً وَّ عَلٰی جُنُوْبِھِمْ وَ یَتفَکَّرُوْنَ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ. رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ ھٰذَا بَاطِلًا. سُبْحٰنَکَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِo رَبَّنَآ اِنَّکَ مَنْ تُدْ خِلِ النَّارَ فَقَدْ اَخْزَیْتَہٗ. وَمَا لِلظّٰلِمِیْنَ مِنْ اَنْصَارٍ o رَبَّنَآ اِنَّنَا سَمِعْنَا مُنَادِیًا یُّنَادِيْ لِلْاِیْمَانِ اَنْ اٰمِنُوْا بِرَبِّکُمْ فَاٰمَنَّا. رَبَّنَا فَاغْفِرْلَنَا ذُنُوْبَنَا وَکَفِّرْ عَنَّا سَیِّاٰتِنَا وَ تَوَفَّنَا مَعَ الْاَبْرَارِo رَبَّنَا وَاٰتِنَا مَا وَعَدْتَّنَا عَلٰی رُسُلِکَ وَلَا تُخْزِنَا یَوْمَ الْقِیٰمَۃِ. اِنَّکَ لَا تُخْلِفُ الْمِیْعَادَo فَاسْتَجَابَ لَھُمْ رَبُّھُمْ اَنِّیْ لَآ اُضِیْعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنْکُمْ مِّنْ ذَکَرٍ اَوْ اُنْثٰی. بَعْضُکُمْ مِنْ م بَعْضٍ. فَالَّذِیْنَ ھَاجَرُوْا وَاُخْرِجُوْا مِنْ دِیَارِھِمْ وَاُوْذُوْا فِیْ سَبِیْلِیْ. وَقَاتَلُوْا وَقُتِلُوْا لَاُکَفِّرَنَّ عَنْھُمْ سَیِّاٰتِھِمْ وَلَاُدْخِلَنَّھُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِھَا الْاَنْھَارُ. ثَوَابًا مِّنْ عِنْدِ اللّٰہِ. وَاللّٰہُ عِنْدَہٗ حُسْنُ الثَّوَابِo

(آل عمران رکوع:۲۰)

مَیں اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتا ہوں کہ اس نے اپنے فضل و کرم سے ہمیں پھر ایک دفعہ اپنے اس نشان کو پورا کرنے والا قرار دیا۔ جو کہ اس نے اپنے مامور اور مُرسل کے لئے دُنیا میں قائم کیا۔ پھر اس نے ہمیں اِس بات کی توفیق دی کہ کسی دُنیوی عزّت کے لئے نہیں کسی دنیوی خواہش کے

لئے نہیں کسی مال و دولت کے لئے نہیں۔ کسی آرام و آسائش کے لئے نہیں۔ بلکہ صرف اسی کی ذات اور اسی کے ذکر کو بلند کرنے کے لئے، اس کے ایمان پر ثبات کے لئے اِس جگہ جمع ہوئے ہیں۔ پھر مَیں اللہ تعالیٰ سے اس بات کی دُعا کرتا ہوں کہ وہ ہماری نیتوں کو درست کرے اور ہمارے عملوں کو صالح بنائے۔

اِس کے بعد مَیں اس مضمون کی طرف متوجہ ہوتا ہوں جسے مَیں نے اللہ تعالیٰ کے فضل کے ساتھ اِس جلسہ میں آپ لوگوں کے سامنے بیان کرنے کا ارادہ کیا ہوا ہے۔ لیکن پیشتر اس کے کہ مَیں اس مضمون کو شروع کروں یہ بتا دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ اس مضمون کے دو حصّے ہیں۔ پہلا حصّہ تو چند ایسے امور پر مشتمل ہے جن کی طرف مَیں جماعت کو سالانہ اجتماع کے موقعہ پر توجہ دلانا ضروری سمجھتا ہوں۔ اور دوسرا حصّہ جس کے متعلق ارادہ ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ چاہے تو آج ہی شروع کر دوں۔ کیونکہ وہ لمبا ہے۔ وہ علمی مضمون ہے۔ جیسا کہ مَیں پچھلے سالوں میں بیان کیا کرتا ہوں۔ اس کی حقیقت آگے چل کر بیان کروں گا۔

(اس موقعہ پر منتظمین جلسہ گاہ نے حضور کی خدمت میں عرض کی کہ لوگ ابھی بہت سے آ رہے ہیں۔ لیکن جلسہ گاہ میں جگہ نہیں ہے۔ لوگوں سے کہا جائے کہ وہ سُکڑ کر بیٹھیں تا کہ جو لوگ باہر ہیں اُن کے لئے بھی جگہ نِکل سکے۔ اس پر حضور نے فرمایا):-

اَب کے ہم نے بہت وسیع جلسہ گاہ بنائی تھی مگر خدا تعالیٰ ثابت کرنا چاہتا ہے کہ مَیں تمہاری اُمید سے بڑھ کر تمہیں سُننے والے دیتا ہوں۔ احباب سُکڑ کر بیٹھیں تا کہ جو دوست باہر ہیں وہ بھی آ سکیں۔ مگر شور نہ ہو اور دوست تقریر غور سے سُنیں۔ مجھے کھانسی ہے اور کھانسی کی وجہ سے آواز بیٹھ گئی ہے۔ گو مجھے خدا تعالیٰ سے اُمید ہے کہ وہ مجھے توفیق دیگا کہ مَیں جو کچھ بیان کرنا چاہتا ہوں وہ دوستوں کو سُنا سکوں۔ مگر اسباب کا لحاظ کرنا بھی ضروری ہے۔ پس احباب خاموشی سے بیٹھیں اور جو کچھ سُنایا جائے غور سے سُنیں۔

سب سے پہلے مَیں اُن چند غلط فہمیوں کا ازالہ کرنا چاہتا ہوں جو میری ذات کے متعلق بعض لوگوں میں پیدا ہو گئی ہیں۔ ہمارے بعض دوست جنہیں باہر جانے کا اتفاق ہوتا ہے اُنہوں نے

بیان کیا ہے۔اور بغیر کسی کا نام لئے بیان کیا ہے (اور مَیں نے بھی ضرورت نہیں سمجھی کہ اُن سے نام پُوچھوں) میری نسبت بعض لوگوں نے کہا ہے کہ وہ خالی بیٹھے رہتے ہیں۔ کام کیا کرتے ہیں۔ ہمیں تو ان کا کوئی کام نظر نہیں آتا؟ ایسے لوگوں کے لئے مَیں اپنی طبیعت کے برخلاف اپنے کام بیان کرتا ہوں۔ تا کہ جن دوستوں کو اس بارے میں شک ہو اُن کا شک دُور ہو جائے۔ کیونکہ شکوک زہر کی طرح ہوتے ہیں جو عروق میں بیٹھے رہیں تو ہلاکت اور موت کا باعث ہوتے ہیں۔

مَیں چونکہ قریب کے گزشتہ ایّام کی نسبت زیادہ تفصیل سے اپنے کام بتا سکتا ہوں اِس لئے انہی کا ذکر کرتا ہوں تا کہ دوستوں کو معلوم ہو جائے کہ جہاں تک میرے نزدیک میری طاقت ہے اس کے مطابق مَیں کام کر لیتا ہوں۔ گو مَیں اس کے لئے بھی تیار ہوں کہ اگر کوئی دوست اس سے زیادہ کام کرنے کا طریق بتائیں تو اس پر بھی عمل کروں مگر اب مَیں جو کام کرتا ہوں ان کی تفصیل یہ ہے کہ مَیں صبح ناشتہ کے بعد مدرسہ خواتین میں پڑھاتا ہوں۔ یہ ایک نیا مدرسہ قائم کیا گیا ہے جس میں چند تعلیم یافتہ عورتوں کو داخل کیا گیا ہے۔ان میں میری تینوں بیویاں اور لڑکی بھی شامل ہیں۔ان کے علاوہ اَور بھی ہیں۔ چونکہ ہمیں اعلیٰ تعلیم دینے کے لئے معلم عورتیں نہیں ملتیں اس لئے چکیں ڈال کر عورتوں کو مرد پڑھاتے ہیں۔آج کل میں ان عورتوں کو عربی پڑھاتا ہوں۔ مولوی شیر علی صاحب انگریزی پڑھاتے ہیں اور ماسٹر محمد طفیل صاحب جغرافیہ۔سوا گھنٹہ تک مَیں انہیں پڑھاتا ہوں۔اصل وقت تو ۴۵ منٹ مقرر ہے مگر سارے استاد اپنا کچھ نہ کچھ وقت بڑھا لیتے ہیں کیونکہ مقررہ وقت کم ہے اور تعلیم زیادہ ہے۔اس کے بعد اس کمرہ میں جہاں دوست ملاقات کرتے ہیں جاتا ہوں۔آج کل اس کی شکل اَور ہے۔ کیونکہ ملاقات کے لئے جگہ نکالنے کے لئے وہاں سے سامان اُٹھا دیا گیا ہے۔ میرے کام کرنے کے ایام میں اس کی یہ شکل ہوتی ہے کہ وہ کتابوں سے بھرا ہوا ہوتا ہے۔ وہاں آ کر میرا دفتری کام شروع ہوتا ہے۔اس جگہ سوا نو بجے کے قریب آتا ہوں۔ اس وقت مَیں سلسلہ کے انتظامی کاموں اور کاغذات اور سکیموں کا مطالعہ کرتا ہوں۔اسی دوران میں دس بجے کے قریب ڈاک آجاتی ہے۔جس میں روزانہ ۶۰، ۷۰، ۸۰ سَو سَوا سَو خطوط ہوتے ہیں جو کم از کم دو اڑھائی گھنٹہ کا کام ہوتا ہے۔اس لئے اِس کام سے مجھے ساڑھے

بارہ بجے یا ایک بجے فراغت ہوتی ہے۔اس کے بعد مَیں کھانا کھانے جاتا ہوں۔ پھر نماز ظہر کے لئے مسجد آتا ہوں۔ نماز پڑھانے کے بعد پھر آکر سلسلہ کے کام جو سلسلہ سے تعلق رکھتے ہیں یا دفاتر کے کاغذات پڑھنے یا تدابیر سوچنے یا بعض علمی مضامین کے لئے مطالعہ کرتا ہوں۔ کیونکہ کئی کتابیں مَیں نے لکھنی شروع کی ہوئی ہیں۔اس کے بعد پھر عصر کی نماز کے لئے جاتا ہوں۔ نماز پڑھانے کے بعد وہاں کچھ دیر دوستوں کے لئے بیٹھتا ہوں۔ اور اگر درس ہو تو درس کے لئے چلا جاتا ہوں یا بیٹھ کر خطوط کے جواب لکھاتا ہوں کہ مغرب کی نماز کا وقت ہو جاتا ہے۔ وہ پڑھاتا ہوں اور اس کے بعد کھانا کھا کر عشاء کی نماز تک مطالعہ کرتا ہوں اور پھر عشاء کی نماز کے بعد کام کے لئے اسی کمرہ میں چلا جاتا ہوں جہاں ۱۱ بجے سے ۱۲ بجے رات تک ترجمہ قرآن کریم کا کام کرتا ہوں۔ پھر علمی شوق کے لئے ذاتی مطالعہ کرتا ہوں۔مگر اس کا فائدہ بھی جماعت کو ہی پہنچتا ہے۔ ساڑھے بارہ بجے یا ایک بجے تک یہ مطالعہ کرتا ہوں۔اس کے بعد جب بستر پر لیٹتا ہوں تو تھکان کی وجہ سے نیند نہیں آتی۔ آنکھوں کے سامنے چیزیں ہلتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ کیونکہ تھکان کی وجہ سے اعصاب کانپ رہے ہوتے ہیں۔ اِسی حالت میں نیند آجاتی ہے۔ پھر صبح کی نماز کے بعد کام کا یہی سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔

یہ میرا کام ہے جو پچھلے تین چار ماہ سے ہو رہا ہے۔اسی کام کے دَوران میں ہستی باری تعالیٰ کے متعلق جو مَیں نے ایک جلسہ کے موقعہ پر تقریر کی تھی اسے قریباً قریباً دوبارہ لکھا ہے۔اسے دو تین بجے رات تک لکھتا رہتا تھا۔ اِن حالات میں جہاں تک مَیں سمجھتا ہوں میرے وقت میں سے کوئی وقت ایسا نہیں بچتا جب مجھے فراغت ہو۔کھانا کھاتے ہوئے بھی مَیں سلسلہ کے متعلق تجاویز اور اہم معاملات پر غور کر رہا ہوتا ہوں۔اور بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ کھانا کھاتے ہوئے بیویاں یہ سمجھ کر کوئی بات دریافت کرلیں کہ اب یہ فارغ ہے تو باوجود اس طرز کی ناپسندیدگی کے مجھے انہیں خشک جواب دینا پڑتا ہے کہ کیا تم میرے چہرہ سے یہ معلوم نہیں کرسکتیں کہ کسی امر کے متعلق غور و فکر کر رہا ہوں تو بسا اوقات کھانا کھانے کے وقت بھی مجھے غور اور فکر میں ہی مشغول رہنا پڑتا ہے۔ گو طبیب اور حکیم کہتے ہیں کہ اِس طرح کھانا کھانے سے کھانا اچھی طرح ہضم نہیں ہوتا۔

مگر جب کسی کو کسی بڑے کام کی فکر لگی ہوئی ہو تو پھر اُسے حکیم کا مشورہ نہیں سُوجھتا۔

مجھے اپنے متعلق یہ خیال سُن کر کہ مَیں کیا کام کرتا ہوں اُس ہر دلعزیز کی مثال یاد آ گئی جس کے متعلق مشہور ہے کہ وہ کہیں گدھا لے کر جا رہا تھا۔ ساتھ اُس کے اس کا بیٹا بھی تھا۔ راستہ میں انہیں کچھ آدمی ملے جنہوں نے کہا کیسے بیوقوف ہیں پیدل جا رہے ہیں اور گدھا خالی ہے۔ سوار کیوں نہیں ہو جاتے۔ یہ سُن کر باپ گدھے پر سوار ہو گیا۔ کچھ دُور جانے کے بعد کچھ اور آدمی ملے۔ جنہوں نے کہا کہ آجکل خون سفید ہو گئے ہیں۔ دیکھو بیٹا تو پیدل جا رہا ہے اور باپ سوار ہے۔ یہ سُن کر باپ اُتر بیٹھا اور بیٹے کو چڑھا دیا۔ تھوڑی دور پر اَور آدمی ملے۔ جنہوں نے کہا دیکھو بڈھا تو پیدل جا رہا ہے اور ہٹا کٹا جوان سوار ہے۔ یہ سُن کر دونوں نے مشورہ کیا کہ باپ بیٹھتا ہے تو بھی اعتراض ہوتا ہے بیٹا بیٹھتا ہے تو بھی اعتراض ہوتا ہے اب یہی تدبیر ہے کہ دونوں بیٹھ جائیں۔ یہ مشورہ کر کے دونوں گدھے پر بیٹھ گئے۔ آگے چلے تو کچھ اور لوگ ملے۔ اُنہوں نے کہا شرم نہیں آتی ایک بے زبان جانور پر ہر دو آدمی سوار بیٹھے ہیں۔ یہ سُن کر وہ دونوں اُتر بیٹھے اور مشورہ کرنے لگے کہ پچھلی سب صورتیں قابلِ اعتراض تھیں اب کیا کیا جائے۔ آخر سوچ کر سوا اِس کے کوئی تدبیر نظر نہ آئی کہ دونوں مل کر گدھے کو اُٹھا لیں۔ آخر اسی طرح کیا۔ مگر گدھے نے لاتیں مارنی شروع کیں اور ایک پُل پر اُلٹ کر گر گیا اور ہلاک ہو گیا اور باپ بیٹا ہر دلعزیزی کی خواہش پر افسوس کرتے ہوئے گھر واپس آ گئے۔ اس خیال کا مطلب یہ ہے کہ انسان خواہ کچھ کرے اس پر اعتراض ضرور ہوتا رہتا ہے۔

ہماری جماعت میں ایک تو وہ لوگ ہیں جو رات اور دن کہتے رہتے ہیں کہ آپ ہر وقت کام میں لگے رہتے ہیں کسی وقت کام نہیں چھوڑتے۔ اور ایک وہ ہیں جو کہتے ہیں کام ہی کیا کرتے ہیں ہمیں تو کوئی کام نظر نہیں آتا۔ اگر نظر نہ آنے والوں کی بات سچی ہے اور یہ بیکار بیٹھنے کی علامت ہے۔ تو اللہ تعالیٰ تو کچھ نہ کرتا ہوگا۔ کیونکہ وہ کسی کو کام کرتا نظر نہیں آتا۔ کام کئی قسم کے ہوتے ہیں۔ کچھ دماغی کام ہوتے ہیں اور کچھ جسمانی۔ ایک شخص جو قوم کے غم میں دن رات تدبیر سوچتا رہتا ہے دیکھنے والا تو اس کے متعلق یہی کہے گا کہ نکما بیٹھا رہتا ہے۔ مگر کیا کوئی عقلمند بھی یہ کہہ سکتا

ہے کہ ایک ٹوکری ڈھونے والا تو کام کرتا ہے مگر وہ دماغی کام کرنے والا نکما بیٹھا رہتا ہے۔ دماغی فکر تو وہ چیز ہے جو ایک دن رات میں انسان کو بوڑھا کر دیتی ہے۔ مگر جسمانی کام انسان کو اور زیادہ طاقتور بناتا ہے۔ حالانکہ دماغی کام نظر نہیں آتا اور جسمانی کام نظر آتا ہے۔ دماغی کام پاس بیٹھنے اور ساتھ رہنے سے معلوم ہو سکتے ہیں۔ جب مَیں گزشتہ سال ولایت گیا تو کوئی انگریز بھی جو ملنے کے لئے آتے گو وہ مسلمان نہ تھے وہ مجھے کام میں مشغول دیکھ کر مشورہ دیتے کہ اس طرح صحت خراب ہو جائے گی۔ آپ کچھ آرام بھی کیا کریں حقیقتِ حال انسان کو ملنے سے ہی معلوم ہو سکتی ہے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا ہے: **خیر کم خیر کم لا ھلہٖ** جس سے ظاہر ہے کہ بیوی کی گواہی خاوند کے متعلق بہت وزن رکھتی ہے۔ اس لئے مسلمان حضرت خدیجہؓ کی گواہی رسول کریم صلی اللہ علیہ آلہٖ وسلم کے متعلق پیش کیا کرتے ہیں۔

ابھی چند دن ہوئے ایک مبلغ کے متعلق میرے پاس شکایت پہنچی کہ اس نے یہ یہ باتیں کہی ہیں۔ اس پر جب ان سے پوچھا گیا تو انہوں نے کہا اور باتیں تو غلط ہیں البتہ یہ مَیں نے کہا ہے کہ جو آدمی ان کے ساتھ رہے اُس سے کام اِس سختی سے لیتے ہیں کہ وہ تنگ ہو جاتا ہے۔ پس میرے کام کا اندازہ ساتھ کام کرنے والے کر سکتے ہیں۔

مجھے خدا تعالیٰ نے ایسی عادت ڈالی ہے کہ مجھے بچپن میں بھی مطالعہ کا شوق تھا۔ بچپن سے میری مراد حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کی وفات کے بعد کا زمانہ ہے۔ میری صحت اِس عادت کی وجہ سے اس قدر کمزور ہو گئی تھی کہ ایک دن حضرت خلیفۃ المسیح اوّلؓ نے ڈاکٹر مرزا یعقوب بیگ صاحب سے اس کے متعلق مشورہ کیا اور مجھ سے فرمایا کہ ڈاکٹر صاحب کہتے ہیں کہ کم سے کم سات گھنٹے ان کو متواتر سونا چاہئے۔ ورنہ صحت خراب ہو جائے گی۔ اور پھر سخت تاکید کی کہ سات گھنٹے متواتر سویا کرو۔ ورنہ صحت زیادہ بگڑ جائے گی اور فرمایا یاد رکھو جو طبیب کا حکم نہ مانے وہ نقصان اُٹھاتا ہے تم اِس حکم کی پابندی کرو۔ مگر باوجود اسکے سوائے سخت بیماری کے ایام کے میری نیند ساڑھے چار گھنٹہ سے چھ گھنٹہ تک ہوتی ہے۔ اِسی وجہ سے اب اعصابی کمزوری اِس قدر بڑھ گئی ہے کہ جو لوگ میرے پیچھے نماز پڑھتے ہیں وہ جانتے ہیں کہ وہ سورتیں جو مَیں روزانہ پڑھتا

ہوں بعض اوقات وہ بھی بھول جاتا ہوں۔ اور نظر اس قدر کمزور ہوگئی ہے کہ بعض اوقات آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا جاتا ہے۔ لیکن باوجود صحت کی یہ حالت ہونے کے مَیں دن رات اس طرح کام کرتا ہوں جو مَیں نے بتایا ہے۔ اور چونکہ اِس قِسم کے خیالات دلوں میں وسوسے ڈالتے ہیں۔ اس لئے مَیں نے ان کا ازالہ ضروری سمجھا ہے۔ یہی دیکھ لو جو دوست جلسہ پر آتے ہیں وہ تو سمجھتے ہوں گے کہ مَیں نے دو دن لیکچر دیا تو یہ کونسا بڑا کام ہے مگر وہ یہی نہیں جانتے کہ اس لیکچر کے لئے مجھے کس قدر مطالعہ کرنا پڑتا ہے۔ جو مسئلہ مَیں بیان کرتا ہوں اس کے متعلق مذاہب کے لوگوں کے خیالات معلوم کرنے کے لئے مجھے بہت کچھ ورق گردانی کرنی پڑتی ہے۔ یہی لیکچر جو مَیں آج دینا چاہتا ہوں اس کی تیاری کے لئے میں نے کم ازکم بارہ سو صفحے پڑھے ہوں گے۔ ان میں سے مَیں نے بہت ہی کم کوئی بات بطور سند کے لی ہے۔ اور یہ صفحات مَیں نے محض خیالات کا موازنہ کرنے کے لئے پڑھے ہیں۔ یہ درست ہے کہ میرے دماغ میں جو باتیں آتی ہیں محض خدا کے فضل سے آتی ہیں۔ مگر خدا کے فضل کے جاذب بھی ہونے چاہئیں۔ اور اس کے لئے فِکر کی ضرورت ہوتی ہے۔ مطالعہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ مراقبہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ پس یہ لیکچر ایک دن کی تقریر نہیں ہوتی بلکہ لمبے غور، لمبے فکر اور لمبے مطالعہ کا نتیجہ ہوتا ہے۔ پھر جلسہ کی تقریریں یونہی چھپ نہیں جاتیں۔ تقریریں لکھنے والا ساری تقریریں مکمل طور پر نہیں لکھ سکتا۔ اسے صاف کر کے لکھنے میں مہینہ کے قریب عرصہ لگ جاتا ہے اور پھر مجھے اس کی لکھی ہوئی تقریروں کی اصلاح کرنی پڑتی ہے۔ تا کہ جس ترتیب سے مضمون بیان کیا جاتا ہے وہی قائم رہے۔

اِس کے بعد مَیں ایک اَور بات کے متعلق کچھ کہنا چاہتا ہوں، اور وہ یہ ہے کہ کہا جاتا ہے کہ مَیں بہت کم لوگوں کو ملاقات کا موقع دیتا ہوں۔ مَیں نے پچھلے جلسوں میں سے کسی میں بیان کیا تھا کہ ملاقات اپنے اندر بہت سے فوائد رکھتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جلسہ کے موقعہ پر باوجود بہت سا کام ہونے کے مَیں دوستوں کو ملاقات کا وقت دیتا ہوں۔ کیونکہ جو لوگ اس طرح الگ ملتے ہیں ان میں بعض کی ایک سال، بعض کی دوسرے سال اور بعض کی تیسرے سال واقفیت ہو جاتی ہے۔ اور اب مَیں اپنی جماعت کے ہزاروں آدمیوں کی پہچان رکھتا اور انہیں پہچان سکتا ہوں۔ اِس

ملاقات کے علاوہ بھی مَیں دوستوں کو علیحدہ ملاقات کا موقعہ دیتا رہتا ہوں لیکن الگ ملنا تبھی ضروری ہوسکتا ہے جبکہ خاص طور پر اس کی ضرورت بھی ہو۔ اور کوئی ایسی بات کرنی ہو جو مجلس میں نہ کی جاسکتی ہو۔ مگر بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ دوست آتے ہیں اور الگ ملنا چاہتے ہیں لیکن جب علیحدہ ملاقات کا موقعہ دیا جاتا ہے تو کہتے ہیں مجھے اپنے لئے دُعا کے لئے کہنا تھا۔ حالانکہ یہ بات وہ مجلس میں بھی کہہ سکتے تھے۔ مگر اس کے لئے میرے وقت میں سے ۱۵-۲۰ منٹ خرچ کرا دیتے ہیں۔ مَیں نے اپنے جو کام پہلے بتائے ہیں ان میں دوستوں سے ملاقات کا وقت بھی ہوتا ہے اور جو دوست کسی ضروری کام کے لئے علیحدہ ملنے کی درخواست کرتے ہیں انہیں مَیں علیحدہ ملنے کے لئے وقت دیتا ہوں۔ مگر مَیں نے چونکہ پچھلے تجربہ سے دیکھ لیا ہے کہ عام طور پر علیحدہ ملاقات کا وقت مقرر کر کے ایسی باتیں کہتے ہیں جو عام مجلس میں بھی کہی جاسکتی ہیں اس لئے اب جو شخص علیحدہ ملاقات کے لئے کہتا ہے اس کے متعلق مَیں اپنے سیکرٹری سے کہتا ہوں کہ پوچھ لو کہ آیا ایسا ضروری کام ہے جو علیحدگی میں ہی کیا جا سکتا ہے۔ اور جب ایسا ہوتا ہے مَیں وقت دے دیتا ہوں۔ مَیں نے اپنے جو کام بتائے ہیں ان سے احباب اندازہ لگا سکتے ہیں کہ میرا کوئی وقت فارغ نہیں ہے۔ دن رات کے ۲۴ گھنٹے مجھے مصروف رہنا پڑتا ہے۔ اب یہ تو میرے لئے ناممکن ہے کہ مَیں دن رات کے ۴۸ گھنٹے بنا لوں۔ پھر مَیں یہ تو کر سکتا ہوں کہ حوائجِ ضروریہ مثلاً کھانا، پینا، پیشاب، پاخانہ، سونا وغیرہ میں تھوڑے سے تھوڑا وقت خرچ کروں مگر مَیں اِن ضرورتوں کو بند نہیں کر سکتا۔ ان حالات میں اگر مَیں بغیر ضرورت کے علیحدہ وقت ملاقات کے لئے دوں تو اس سے دوسرے کاموں میں حرج واقعہ ہوگا۔ بعض دفعہ مَیں نے دیکھا ہے۔ کوئی دوست ملنے کے لئے آئے تو میرا ہاتھ پکڑ کر ۱۵-۱۵، ۲۰-۲۰ منٹ یہی کہتے جاتے ہیں۔ میرے لئے ضرور دُعا کرنا۔ چونکہ میں ہر بار اُن کے جواب میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ ضرور دُعا کروں گا اس لئے کسی کسی وقت کہہ دیتا ہوں۔ ہاں ضرور کرونگا اور پھر خاموش ان کی بات سُنتا رہتا ہوں۔ مَیں اِس طریق کو روکنا چاہتا ہوں۔ اور یہ بھی آپ ہی لوگوں کے فائدہ کے لئے۔ تاکہ مَیں اپنا وقت ضروری کاموں میں لگا سکوں۔ اس طریق کی بجائے اگر کوئی صاحب میرا زیادہ وقت لئے بغیر دُعا کے لے کہیں تو مجھے

اُن کی طرف زیادہ توجہ پیدا ہو۔ کیونکہ مَیں سمجھوں کہ ان کو میرے وقت کی قدر ہے۔ لیکن جو لوگ دیر تک ہاتھ پکڑے رکھتے ہیں اُن کے سامنے مَیں بظاہر تو بشاشت قائم رکھتا ہوں لیکن میرا دل تلملا رہا ہوتا ہے کہ ان کی وجہ سے میرے فلاں کام میں حرج ہو رہا ہے۔ اِس طریق سے ملاقات کرنے والوں کو مَیں روکنا چاہتا ہوں۔ لیکن اگر کسی کو ضروری کام ہو تو اس سے مَیں دن رات میں ہر وقت ملنے کے لئے تیار ہوں۔

مَیں مُلاقات کو نہایت ضروری سمجھتا ہوں۔ اور جس طرح مَیں ان کو غلطی پر سمجھتا ہوں جو بلا ضرورت اور بلا وجہ میرا وقت صرف کرتے ہیں۔ اسی طرح مَیں اُن کو بھی غلطی پر سمجھتا ہوں جو یہ کہتے ہیں کہ ملنا ہی نہیں چاہئے۔ جب بھی موقعہ ملے یہاں ضرور آنا چاہئے اور مجھ سے ملنا چاہئے۔ ہاں اگر کوئی ایسی بات کرنی ہو جو مجلس میں نہ کی جاسکتی ہو۔ مثلاً کوئی ایسی بیماری ہو یا اپنے خاص حالات ہوں یا کوئی اور ایسی ہی بات ہو تو اس کے لئے مَیں علیحدہ ملنے کے واسطے بھی تیار ہوں۔ اب تو بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ کئی دوست بعض سوالات لِکھ کر لاتے ہیں اور ان کے متعلق علیحدہ پوچھتے ہیں۔ اُس وقت مجھے بہت افسوس ہوتا ہے کہ اگر یہی سوال مجلس عام میں پوچھتے تو اوروں کو بھی فائدہ ہوتا۔ مثلاً یہی سوال کہ نماز میں توجہ کیونکر قائم رہ سکتی ہے۔ ظاہر ہے کہ اِس سوال کا جواب اور لوگوں کو بھی فائدہ پہنچا سکتا ہے۔ مگر پوچھنے والے صاحب علیحدہ وقت لیکر پوچھتے ہیں اور عام لوگوں کو اس کے فائدہ سے محروم رکھتے ہیں۔ اِس قِسم کی علیحدہ ملاقات کرنے والوں کو روکنا چاہتا ہوں۔ ورنہ ملاقات کا حکم تو قرآن مجید میں بھی موجود ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ كُونُوْا مَعَ الصّٰدِقِيْنَ. جو لوگ اللہ تعالیٰ سے سچا تعلق رکھتے ہیں ان سے ملتے رہا کرو۔ پس ملاقات ضروری ہے۔ اور اس قدر ضروری ہے کہ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام فرمایا کرتے تھے۔ جو لوگ ہمارے پاس نہیں آتے اُن کے ایمان کا خطرہ ہے۔ بعض لوگ ایسے ہیں جو یہاں آتے تو ہیں لیکن مجلس میں دوسروں کے پیچھے بیٹھے رہتے ہیں اور پھر چلے جاتے ہیں وہ سمجھتے ہیں مَیں اُن کو دیکھ رہا ہوتا ہوں۔ لیکن ہمارے خاندان کے لوگوں کی آنکھیں اس قِسم کی ہیں کہ اوپر کو زیادہ نہیں کھل سکتیں۔ ان کے اوپر گوشت زیادہ ہے۔ جس کی وجہ سے نیچے جھکی رہتی ہیں۔

اور اگر زیادہ کھولیں تو درد ہونے لگتا ہے۔ پس جو دوست یہاں آئیں اُنہیں مَیں نصیحت کرتا ہوں کہ وہ مجھے ملیں۔ اور انہیں یہ بھی بتانا چاہئے کہ وہ کب تک رہیں گے اور اپنے اور اپنی جگہ کے حالات سے اطلاع دینی چاہئے۔ اس طرح اُن کی طرف خاص توجہ کرنے کا موقعہ ملتا ہے اور اُن کے لئے دُعا کی طرف توجہ ہوتی ہے۔

اِس کے بعد مَیں ایک اور شُبہ کا ازالہ کرنا چاہتا ہوں بعض دوستوں کا یہ خیال بیان کیا گیا ہے کہ دُعا کے لئے لکھنے کا کیا فائدہ ہے۔ اور وہ اتنے لوگوں کے لئے کہاں دُعا کرتے ہوں گے۔

اِس میں شُبہ نہیں کہ اگر کسی کو یہ خیال ہو کہ جس دوست کی دُعا کے لئے چٹھی آئے اُس کے لئے مَیں آدھ گھنٹہ یا گھنٹہ الگ بیٹھ کر دُعا کرتا ہوں تو یہ درست نہیں۔ مَیں نہ اِس طرح کرتا ہوں اور نہ کر سکتا ہوں۔ سو کے قریب روزانہ قادیان کے رُقعے ملا کر دُعا کی درخواستیں ہوتی ہیں اور بعض اِس قسم کے خطوط لکھتے ہیں کہ ہمارے لئے دُعا کرتے رہنا۔ ان کو بھی اگر ملایا جائے تو یہ تعداد اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ ان کے لئے اگر ایک ایک منٹ بھی علیحدہ دُعا کے لئے رکھا جائے اور پھر اسلام کی ضروریات کو شامل کیا جائے تو تین چار گھنٹے صرف ایک وقت کی دُعا کے لئے چاہئے ہوتے ہیں۔ اس لئے مَیں اسی طرح کرتا ہوں جس طرح حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کیا کرتے تھے۔ آپ کا قاعدہ تھا کہ خط پڑھتے جاتے اور ساتھ ساتھ دُعا بھی کرتے جاتے۔ مَیں بھی اسی طرح کرتا ہوں۔ اس وجہ سے خط بھی خاص توجہ سے پڑھا جاتا ہے اور اکثر اوقات ایسا ہوتا ہے کہ ایک خط سیکرٹری کے ہاتھ میں ہوتا ہے اور وہ مجھے سُنا رہا ہوتا ہے لیکن مَیں کہتا ہوں۔ اِس میں یہ نہیں بلکہ یہ لکھا ہے۔ اور میری ہی بات درست نکلتی ہے۔ غرض دُعا کی وجہ سے مَیں خط پڑھنے میں پوری توجہ دیتا ہوں اور خط کا سارا مضمون میرے ذہن نشین ہو جاتا ہے۔ ایک تو اس طرح دُعا کرتا ہوں۔ دوسرے یہ طریق مَیں نے رکھا ہے کہ نوافل میں دعا کرتا ہوں اور پچھلے دنوں سے تو جماعت کی ترقی اور مشکلات کے ازالہ کے لئے ہر فرض نماز میں دُعا کرتا ہوں۔ اس دعا میں علاوہ اسکے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر درود پڑھتا ہوں اور حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام پر بھی درود بھیجتا ہوں اِنکے درجات کی بلندی کے لئے دُعا کرتا ہوں کہ خدا تعالیٰ ان کی

بعثت کے اغراض کو ہمارے ذریعہ سے پورا کرے۔ ان کے نہ ماننے والوں اور اعتراض کرنے والوں کو سمجھ دے سلسلہ کی مشکلات اور تکالیف کو دور کرے اور ترقی کے سامان پیدا کرے۔ پھر جب سے کابل کے واقعاتِ شہادت ہوئے ہیں روزانہ یہ بھی دُعا کرتا ہوں کہ خدا تعالیٰ ہمارے وہاں کے بھائیوں کی مدد اور نصرت فرمائے اور انہیں دشمنوں کے ہر شر سے محفوظ رکھے۔ پھر یہ دُعا بھی کرتا ہوں کہ خدا تعالیٰ اسلام کی صداقت کو مشرق اور مغرب میں پھیلائے۔ اور سب انسانوں کو اسلام میں داخل کرے۔ پھر ساری جماعت کے لئے دُعا کرتا ہوں۔ جس کا خلاصہ یہ ہے کہ خدا تعالیٰ جماعت کی مالی، جسمانی، اخلاقی، علمی، روحانی ہر قسم کی روکوں کو دور کر کے ان تمام اقسام میں ترقی کے سامان پیدا کرے۔ پھر سلسلہ کے جو اہم کام ہوتے ہیں ان کے لئے دُعا کرتا ہوں۔ پھر یہ دُعا کرتا ہوں کہ جنہوں نے مجھے دُعا کے لئے لکھا ہے اللہ تعالیٰ ان کے دُکھ اور تکالیف دور کر کے اُن کے لئے راحت کے راستے کھول دے۔ اس وقت وہ لوگ جن کی مشکلات کا میرے دل پر خاص اثر ہوتا ہے ان کے نام لیکر ان کے لئے دُعا کرتا ہوں۔

پھر یہ دُعا کرتا ہوں کہ الٰہی ہماری موجودہ جماعت پر ہی فضل نہ فرما۔ بلکہ اس کی اولاد پر بھی فضل فرما۔ پھر سلسلہ کے کارکنوں کے لئے دُعا کرتا ہوں کہ اُنہیں اپنے فرائض کی ادائیگی کی سمجھ عطا فرما۔ اپنے فضلوں کا وارث بنا۔ لوگوں سے ہمدردی اور تعاون کا طریق سکھا۔ جماعت کا ان کے ساتھ تعاون اور ہمدردی ہو۔

پھر وہ دوست جو تبلیغ کے لئے گئے ہوئے ہیں اُن کے لئے اور اُن کے گھر والوں کے لئے دُعا کرتا ہوں۔ پھر جو مصائب میں مبتلا ہیں اُن کے لئے دُعا کرتا ہوں۔ یہ دعائیں پانچوں وقت بلا ناغہ علاوہ نوافل کے فرض نمازوں میں کرتا ہوں۔ اب بھی اگر کوئی کہے کہ مَیں جماعت کے لئے دعائیں نہیں کرتا تو ایسا ہی ہے جیسے کوئی دن کے وقت کہے سورج نہیں نکلا ہوا۔ مَیں جس طرح دُعا کرتا ہوں۔ ۹۰ فیصدی ایسے لوگ ہوں گے جو خود بھی اپنے لئے اس طرح دُعا نہیں کرتے ہوں گے۔

ایک اور خیال مجھے بتایا گیا ہے۔ اور یہ کہ بعض لوگ کہتے ہیں کہ خلیفہ سے چونکہ اختلاف

جائز ہے اس لئے ہمیں ان سے فلاں فلاں بات میں اختلاف ہے۔مَیں نے ہی پہلے اس بات کو پیش کیا تھا اور مَیں اب بھی پیش کرتا ہوں کہ خلیفہ سے اختلاف جائز ہے۔مگر ہر بات کا ایک مفہوم ہوتا ہے۔اس سے بڑھنا دانائی اور عقلمندی کی علامت نہیں ہے۔دیکھو کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ ڈاکٹر کی ہر رائے درست ہوتی ہے۔ہرگز نہیں ڈاکٹر بیسیوں دفعہ غلطی کرتے ہیں مگر باوجود اس کے کوئی یہ نہیں کہتا کہ چونکہ ڈاکٹر کی رائے بھی غلط ہوتی ہے اس لئے ہم اپنا نسخہ آپ تجویز کریں گے۔ کیوں؟ اس لئے کہ ڈاکٹر نے ڈاکٹری کا کام باقاعدہ طور پر سیکھا ہے۔اور اسکی رائے ہم سے اعلیٰ ہے۔اسی طرح وکیل بیسیوں دفعہ غلطی کر جاتے ہیں۔مگر مقدمات میں انہی کی رائے کو وقعت دی جاتی ہے۔اور جو شخص کوئی کام زیادہ جانتا ہے۔اس میں اس کی رائے کا احترام کیا جاتا ہے۔پس اختلاف کی بھی کوئی حد بندی ہونی چاہیئے۔ایک شخص جو خلیفہ کے ہاتھ پر بیعت کرتا ہے اُسے سمجھنا چاہیئے کہ خلفاء خدا مقرر کرتا ہے۔اور خلیفہ کا کام دن رات لوگوں کی راہ نمائی اور دینی مسائل میں غور و فکر ہوتا ہے۔اسکی رائے کا دینی مسائل میں احترام ضروری ہے۔اور اس کی رائے سے اختلاف اُسی وقت جائز ہوسکتا ہے جب اختلاف کرنے والے کو ایک اور ایک دو کی طرح یقین ہو جائے کہ جو بات وہ کہتا ہے وہی درست ہے۔پھر یہ بھی شرط ہے کہ پہلے وہ اس اختلاف کو خلیفہ کے سامنے پیش کرے اور بتائے کہ فلاں بات کے متعلق مجھے یہ شُبہ ہے۔اور خلیفہ سے وہ شبہ دور کرائے۔جس طرح ڈاکٹر کو بھی مریض کہہ دیا کرتا ہے کہ مجھے یہ تکلیف ہے آپ بیماری کے متعلق مزید غور کریں۔پس اختلاف کرنے والے کا فرض ہے کہ جس بات میں اُسے اختلاف ہو اُسے خلیفہ کے سامنے پیش کرے نہ کہ خود ہی اس کی اشاعت شروع کر دے۔ورنہ اگر یہ بات جائز قرار دی جائے کہ جو بات کسی کے دل میں آئے وہی بیان کرنی شروع کر دے تو پھر اسلام کا کچھ بھی باقی نہ رہے۔کیونکہ ہر شخص میں صحیح فیصلہ کی طاقت نہیں ہوتی۔ورنہ قرآن شریف میں یہ نہ آتا کہ جب امن یا خوف کی کوئی بات سنو تو اولی الامر کے پاس لے جاؤ۔کیا اولی الامر غلطی نہیں کرتے؟ کرتے ہیں۔مگر ان کی رائے کو احترام بخشا گیا ہے۔اور جب انکی رائے کا احترام کیا گیا ہے تو خلفاء کی رائے کا احترام کیوں نہ ہو۔ہر شخص اس قابل نہیں ہوتا کہ ہر بات کے متعلق صحیح نتیجہ

پر پہنچ سکے۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے۔ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا۔ اگر کوئی شخص تقویٰ کے لئے سو بیویاں بھی کرے تو اس کے لئے جائز ہیں۔ ایک شخص نے یہ بات سُن کر دوسرے لوگوں میں آ کر بیان کیا کہ اب چار بیویاں کرنے کی حد نہ رہی سو تک انسان کر سکتا ہے اور یہ بات حضرت مسیح موعودؑ نے فرمادی ہے۔ آپ سے جب پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا۔ میری تو اِس سے یہ مراد تھی کہ اگر کسی کی بیویاں مرتی جائیں تو خواہ اس کی عمر کوئی ہو تقویٰ کے لئے شادیاں کر سکتا ہے۔

پس ہر شخص ہر بات کو صحیح طور پر نہیں سمجھ سکتا۔ اور جماعت کے اتحاد کے لئے ضروری ہے کہ اگر کسی کو کسی بات میں اختلاف ہو تو اُسے خلیفہ کے سامنے پیش کرے۔ اگر کوئی شخص اس طرح نہیں کرتا اور اختلاف کو اپنے دل میں جگہ دیکر عام لوگوں میں پھیلاتا ہے تو وہ بغاوت کرتا ہے۔ اسے اپنی اصلاح کرنی چاہئے۔

اس کے بعد مَیں ایک اور نصیحت کرتا ہوں۔ اور وہ یہ ہے کہ حقہ بہت بری چیز ہے۔ ہماری جماعت کے لوگوں کو یہ چھوڑ دینا چاہئے۔ بعض لوگوں نے مجھے کہا ہے ہم نے ایسے ملہم دیکھے ہیں۔ جو حقہ پیتے تھے اور اُن کو الہام ہوتا تھا۔ اس کے متعلق مجھے ایک لطیفہ یاد آ گیا۔ جو حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام بیان فرمایا کرتے تھے کہ کچھ بنیئے بیٹھے یہ کہہ رہے تھے کہ اگر کوئی ایک پاؤ تِل کھائے تو اُسے پانچ روپے انعام دیا جائے گا۔ پاس سے ایک زمیندار گزرا۔ اُس نے یہ سُن کر پنجابی میں کہا کہ سَلّیاں سمیت کہ اینویں۔ یعنی اُن شاخوں سمیت تِل کھانے ہیں جن میں وہ پیدا ہوتے ہیں یا ان کے بغیر کیونکہ اس نے سمجھا ایک پاؤ تِل کھانا کونسی بڑی بات ہے جس پر انعام مِل سکتا ہے۔ بنیئے کہنے لگے تم جاؤ ہم تمہاری بات نہیں کرتے۔ تو طبائع میں اختلاف ہوتا ہے ایک شخص کے نزدیک جو بات بڑی ہوتی ہے دوسرا اُسے معمولی سمجھتا ہے۔ اگر ہم یہ تسلیم بھی کر لیں کہ حقہ پینے والے کو خدائی الہام ہوتے ہیں۔ تو کہنا پڑے گا کہ وہ الہام اعلیٰ درجہ کے نہ ہوں گے۔ کیونکہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم تو یہاں تک فرماتے ہیں۔ کہ لہسن کھا کر مسجد میں نہ آؤ۔ اس کی بدبو کی وجہ سے فرشتے نہیں آتے۔ پھر رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے سامنے کچا لہسن رکھا

گیا تو آپ نے نہ کھایا۔ صحابہؓ نے پوچھا۔ یا رسول اللہ ہم بھی نہ کھائیں۔ فرمایا۔ تم سے خدا کلام نہیں کرتا تم کھا سکتے ہو۔ اِن حدیثوں کے ہوتے ہوئے کس طرح مان لیں کہ حقہ پینے والے کے پاس فرشتے آتے ہیں۔ جبکہ حقہ کی بدبو لہسن سے بھی زیادہ خراب ہوتی ہے۔ اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم حقہ سے کم بدبو والی چیز کے متعلق فرماتے ہیں کہ مَیں اسے استعمال نہیں کرتا۔ کیونکہ میرے پاس فرشتے آتے ہیں۔ پس جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اس قدر احتیاط کرتے تھے تو جو شخص الہام کا مدّعی ہے یا جسے خواہش ہے کہ اُسے الہام ہو اُسے بھی حقہ سے بچنا چاہئے۔ اور مَیں اس کی شکل دیکھنا چاہتا ہوں جو یہ کہے کہ مجھے الہام کی خواہش نہیں۔ اگر کوئی ایسا شخص نہیں تو پھر کسی کو حقہ بھی نہیں پینا چاہئے۔

پھر مَیں کہتا ہوں ممکن ہے ایسے شخص کو الہام ہو بھی جائے۔ مگر اعلیٰ درجہ کے الہام نہیں ہوں گے۔ اور ہم کہیں گے اگر وہ حقہ نہ پیتا تو اس سے اعلیٰ الہام اسے ہوتا جیسا کہ حقہ پینے کی عادت رکھتے ہوئے اُسے ہوا۔ اس کے پاس ادنیٰ فرشتے آجاتے ہوں گے۔ حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے لکھا ہے۔ بعض اوقات کنچنی کو بھی الہام ہو جاتا ہے۔ وہاں فرشتے جاتے ہیں یا نہیں۔ اسی قسم کے فرشتے حقہ پینے والے کے پاس آجاتے ہونگے۔ پس اگر کسی حقہ پینے والے کو الہام ہوتا ہے تو ہم کہتے ہیں یہ اس کے لئے خوشی کی بات نہیں۔ لیکن اگر وہ حقہ پینا چھوڑ دیتا تو اس کے پاس اعلیٰ درجہ کے فرشتے آتے۔

اس کے بعد مَیں ایک دوست کی عزّت اور احترام کا ذکر کرنا چاہتا ہوں۔ گذشتہ مجلس مشاورت میں ایک سوال اُٹھایا گیا تھا جو ایڈیٹر نور صاحب کے متعلق تھا۔ خیال کیا گیا تھا کہ ان کے ایماء سے وہ بات سوال کرنے والے نے اٹھائی ہے۔ اس کے متعلق مَیں نے اگر کی شرط لگا کر کہا تھا کہ اگر انہوں نے ایسا کیا ہے تو غلطی کی ہے۔ مگر بعد میں معلوم ہوا کہ انہوں نے ایسا نہیں کیا۔ اسلئے جب رپورٹ شائع ہوئی تو اس میں سے وہ حصہ کاٹ دیا گیا تھا۔ مگر افسوس ہے کہ ایڈیٹر صاحب فاروق نے اس ذکر کو شائع کر دیا۔ مجھے زیادہ افسوس اس بات کا ہے کہ فاروق کے متعلق وہ باتیں کہی تھیں۔ گویا فاروق کی طرف سے مَیں نے بدلا لے لیا تھا۔ مگر فاروق نے اسے

کافی نہ سمجھا مَیں نے اس وقت فاروق کی ممکن سے ممکن حمایت کی تھی مگر ایڈیٹر صاحب فاروق نے اس پر صبر نہ کیا اور ایک بھائی کے خلاف خود قلم چلایا۔ چونکہ اِس امر کو اخبار میں شائع کیا گیا ہے۔ اس لئے اس کا ذبّ بھی مجلس میں ہی کرتا ہوں۔ یہ اگر کسی کو بُرا لگے تو وہ اپنے نفس پر افسوس کرے۔ جس نے اس سے ایسا فعل[1] کرایا۔

اب مَیں جماعت کو مالی حالت کے متعلق کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ ہمارے سلسلہ کی مالی حالت ان دنوں نہایت کمزور ہے۔ ہمارے دوستوں سے جس قدر ممکن ہوسکتا ہے مدد کرتے ہیں مگر باوجود اِسکے ہماری ضروریات پوری نہیں ہوتیں۔ ہماری ضروریات سے مراد میری ذاتی ضروریات نہیں۔ ان ہماری ضروریات میں مَیں بھی اتنا شریک ہوں جتنے آپ لوگ شریک ہیں۔ کیونکہ ان سے مراد سلسلہ کی ضروریات ہیں۔ اب مشکلات کی جو حالت ہے ان کو زیادہ لمبا نہیں جانے دیا جاسکتا۔ کیونکہ اس سے فتنہ پیدا ہوتا ہے۔ اب بھی یہ حالت ہے کہ کارکنوں کو تین تین ماہ کی تنخواہیں نہیں ملیں اور ان میں سے ۲۵-۳۰ آدمی مجھے ایسے معلوم ہیں جنہیں کئی کئی وقتوں کا فاقہ گذر چکا ہے۔ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ایک پرانے صحابی ایک دن میرے پاس آئے اور آکر رو پڑے کہ اتنے دنوں کا فاقہ ہے۔ اور کام کرتے ہوئے غشی کے قریب حالت پہنچ جاتی ہے۔ اس حالت میں مَیں نے ارادہ کیا کہ گھر بار چھوڑ کر کہیں جنگل میں جا بیٹھوں۔ مگر اس خیال سے باز رہا کہ خودکشی نہ ہو۔ آپ لوگ سمجھ سکتے ہیں کہ ایسی حالت میں اِس بات کو دیر تک التواء میں نہیں رکھا جاسکتا۔ بے شک باہر کی جماعتوں کے افراد کو تکالیف کا سامنا ہے کیونکہ وہ کوئی امیر کبیر نہیں ہیں۔ گر مَیں کہتا ہوں کہ کیا انکو بھی ایسی ہی تنگی درپیش ہے۔ جیسی یہاں ہم کو ہے؟ ایک دن تو ان تکالیف کی وجہ سے مجھے ایسا معلوم ہوا کہ میری قوتِ ارادی بالکل جانے لگی ہے۔ اور قریب تھا کہ مَیں اپنے تَن کے کپڑے پھاڑ ڈالوں۔ بے شک ہماری جماعت پر بہت بوجھ ہے اور وہ بہت کچھ خدا کی راہ میں خرچ کرتی ہے۔ مگر جماعت نے ہی سارا بوجھ اُٹھانا ہے۔ غیروں

---

[1] ایڈیٹر صاحب فاروق نے بھی مومنانہ طور پر اسی وقت اس غلطی پر ندامت کا اظہار کردیا تھا۔ اس لئے ان پر بھی کوئی الزام نہیں۔

سے تو ہم نے کچھ لینا نہیں ۔مَیں نے ابھی کہا ہے کہ ہماری جماعت نے بہت بوجھ اٹھایا ہوا ہے لیکن جماعت کی مجموعی حالت کو دیکھ کر مَیں کہہ سکتا ہوں کہ ہماری جماعت نے ابھی اتنی مالی قربانی نہیں کی جتنی پہلی جماعتیں قربانی کرتی رہی ہیں۔ مَیں نے روم میں وہ مقام دیکھا ہے جہاں حضرت مسیحؑ کے ماننے والے اپنے دشمنوں کی سختیوں اور ظلموں سے بچنے کے لئے رہے۔ بیس میل کے قریب وہ مقام لمبا ہے۔ وہاں عیسائی اپنے گھر بار مال واموال چھوڑ کر چلے گئے تھے۔ اور وہ فاقے پر فاقے اُٹھاتے تھے۔ سورہ کہف میں ان کا نام اصحاب کہف والرقیم رکھا گیا ہے۔ ہم چند گھنٹے کے لئے وہاں گئے۔ مگر کئی دوست وہاں ٹھہرنا برداشت نہ کر سکے۔ حالانکہ وہ لوگ وہاں کئی سال تک دقیانوس کے وقت رہے۔ وہ نہایت تنگ و تاریک گیلی مٹی کے غار ہیں سرکاری فوجوں نے ان میں سے جن کو وہاں مارا ان کی قبریں بھی وہیں بنی ہوئی ہیں اور اُن پر کتبے لگے ہیں یہ فلاں وقت مارا گیا۔ یہ وہ لوگ تھے جنہوں نے خدا کے لئے سب کچھ چھوڑ دیا تھا اور ایسی ایسی تکلیفیں برداشت کی تھیں جن کا خیال کر کے اب بھی رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ آپ لوگوں کا عقیدہ ہے کہ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام حضرت مسیح ناصریؑ سے بڑے تھے۔ پھر آپ لوگوں کو یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ ہماری قربانیاں بھی حضرت مسیحؑ کے ماننے والوں سے بڑی ہوں۔ مگر کیا اس وقت تک کی ہماری قربانیاں ایسی ہی ہیں؟ دیکھو حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا ہے جو وصیت نہیں کرتا وہ منافق ہے اور وصیت کا کم از کم چندہ $\frac{1}{10}$ حصّہ مال کا رکھا ہے۔ جس میں عام چندہ جو وقتاً فوقتاً کرنا پڑے شامل نہیں۔ مگر ہماری جماعت اس وقت اپنی آمد کا $\frac{1}{16}$ حصّہ چندہ میں دیتی ہے اور بعض یہ بھی نہیں دیتے بلکہ اس سے کم شرح سے دیتے ہیں۔ اور بعض بالکل ہی نہیں دیتے۔ مگر باوجود اس کے کہا جاتا ہے۔ ہم پر بڑا بوجھ پڑا ہوا ہے۔ مگر سوال یہ ہے کہ جو کام کرنے کا ہم نے تہیہ کیا ہے وہ کتنا بڑا ہے۔ اب جو لوگ کہتے ہیں کہ ہم پر بڑا بوجھ پڑ گیا اُن کی حالت اُس شخص کی سی ہے جو ہاتھی اُٹھانے کے لئے جائے اور جب اُٹھانے لگے تو کہے یہ تو بڑا بوجھ ہے۔ یا اُس شخص کی سی ہے جو اپنے ہاتھ میں آگ کا انگارا پکڑنا چاہے اور پھر کہے اس سے تو ہاتھ جلتا ہے۔ پس جو قوم یہ کہتی ہے کہ وہ دُنیا کو اس طرح اُڑا دینے کی کوشش کر رہی ہے جس طرح

ڈائنا میٹ پہاڑ کو اُڑا دیتا ہے اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ ڈائنا میٹ کی طرح پھٹ کر اپنے آپ کو تباہ کر لے۔ کیا کبھی بارُود خود قائم رہ کر کسی چیز کو اُڑا سکتا ہے؟ یا ڈائنا میٹ اپنے آپکو تباہ کئے بغیر کوئی تغیر پیدا کر سکتا ہے؟ اگر نہیں اور یقیناً نہیں تو تمہیں اسی طرح کرنا پڑیگا۔ اگر تم تھوڑے سے ہو کر دُنیا کو فتح کرنا چاہتے ہو تو ڈائنا میٹ بنکر ہی فتح کر سکتے ہو۔ کیونکہ تھوڑا سا ڈائنا میٹ ہی ہوتا ہے جو ایک بڑے خطّہ کو تہ و بالا کر دیتا ہے۔ اور اسکے یہ معنے ہیں کہ ہم دُنیا کو اُڑانے سے پہلے آپ اُڑ جائیں گے۔ کیا یہ حالت تم میں پیدا ہو گئی ہے اور اس درجہ تک تم پہنچ گئے ہو؟ اگر نہیں تو ساری دُنیا کو فتح کرنیکا ارادہ رکھتے ہوئے کس طرح کہہ سکتے ہو کہ تم پر بہت بوجھ پڑ گیا تم میں سے ہر ایک کو اپنی حالت پر غور کرنا چاہئے اور دیکھنا چاہئے کہ اس نے اس مُدعا اور مقصد کے پورا کرنے میں کس قدر سعی اور کوشش کی ہے جو ہر ایک احمدی کا اوّلین فرض ہے اور جس کے لئے وہ پیدا ہوا ہے۔ اگر اس بات کو مدنظر رکھ کر تم اس بوجھ کو دیکھو گے جسے تم نے اس وقت تک اُٹھایا ہے تو معلوم ہو جائے گا کہ وہ تو کچھ بھی نہیں ہے۔

مَیں یہ نہیں کہتا کہ تم میں سے سارے کے سارے ایسے ہیں جنہیں اس بات کا احساس نہیں کہ وہ کس مقصد اور مُدعا کر لیکر کھڑے ہوئے ہیں اور اس کے لئے کس قدر سعی اور کوشش کی ضرورت ہے۔ بڑے بڑے مخلص بھی ہیں۔ ایک دوست جن کی تنخواہ ۶۰ روپے ماہوار ہے انہوں نے اپنی آمدنی کے ۱/۳ حصّہ کی وصیّت کی ہوئی ہے۔ یعنی بیس روپے ماہوار چندہ دیتے ہیں۔ جب چندہ خاص کی تحریک ہوئی تو اس میں انہوں نے تین ماہ کی تنخواہ دے دی اور اس طرح وہ مقروض ہو گئے۔ اس پر انہوں نے خط لکھا کہ کیا مَیں قرضہ ادا ہونے تک ۱/۱۰ حصّہ آمد کا چندہ میں دے سکتا ہوں۔ مگر اس سے ۵-۶ دن بعد انکا خط آ گیا کہ مجھے پہلا خط لکھنے پر بہت افسوس ہوا۔ مَیں اپنی آمد کا ۱/۳ حصّہ ہی چندہ میں دیا کرونگا تو ایک حصّہ جماعت کا ایسے مخلصین کا بھی ہے اور یہ بڑا حصّہ ہے مگر مَیں باقیوں کو بھی نصیحت کرتا ہوں کہ وہ بھی ایسے ہی بنیں۔ اور ہماری تو یہ حالت ہونی چاہئے کہ ایک قطرہ بھی ہمارے اپنے لئے نہ ہو بلکہ ہمارے لئے وہی رہنا چاہئے جو ہمارا نہیں رہا۔ یعنی جان بچانے، ستر ڈھانکنے کے لئے جو خرچ ہو وہ کیا جائے باقی سب کچھ خدا کے لئے

سمجھا جائے۔ دیکھیں آپ لوگ جماعت میں داخل ہوکر جو وعدہ کرتے ہیں وہ کتنا بڑا ہے۔ اس کا یہ مطلب ہے کہ ہماری جان، ہمارا مال، ہماری عزّت، ہماری آبرو، ہمارا آرام، ہماری آسائش، ہماری دولت، ہماری جائداد، غرض کہ ہمارا سب کچھ خدا کا ہوگیا۔ یہ بیعت کے معنے ہیں جن کا خلاصہ یہ ہے کہ جو کچھ میرا ہے وہ میرا نہیں بلکہ خدا ہی کا ہے۔ مثلاً سو روپیہ تنخواہ ہے تو اس کی نہیں بلکہ خدا کے لئے ہوگئی۔ پھر جو کچھ میں جان بھی شامل ہے۔ یہ بھی اس کی نہیں پھر جو کچھ میں بیوی بچے ہیں یہ بھی اس کے نہیں۔ کوئی عزّت اور عہدہ ہے یہ بھی اس کا نہیں۔ یہ اقرار کرنے کے بعد اگر کوئی شخص چندہ خاص کے وقت کہے کہ یہ بہت بڑا بوجھ ہے تو وہ بتائے بیعت کرتے وقت اس نے جو اقرار کیا تھا اس کا کیا مطلب تھا۔ یا تو یہ مانو کہ اس کا یہ مطلب تھا کہ بیعت کرنے یعنی اپنا سب کچھ بیچ دینے سے مراد سارا جسم مراد نہ تھا۔ بلکہ ایک ٹانگ یا ایک ہاتھ مراد تھا۔ یا اس سے مراد سارا مال نہ تھا بلکہ اتنا اتنا مال تھا تو اس کی رعایت رکھ لی جائے لیکن اگر یہ اقرار تھا کہ مَیں اپنا سارا مال، جان، بیوی، بچے، عہدے سب تجھے دیتا ہوں تو پھر وہ کس منہ سے کہہ سکتا ہے کہ بوجھ پڑ گیا۔ بوجھ کے معنے تو یہ ہیں کہ گویا وہ کہتا ہے جس قدر دینے کا مَیں نے اقرار کیا تھا اس سے زیادہ دینا پڑ گیا۔ یا جس چیز کے دینے کا وعدہ کیا تھا اس کے علاوہ اور بھی دینی پڑی۔ حالانکہ اس کا اقرار یہ ہے کہ اس نے اپنا سب کچھ دے دیا۔ ایسی حالت میں وہ بوجھ کس طرح کہہ سکتا ہے۔ مَیں امید رکھتا ہوں کہ تمام دوست بیعت کے صحیح مفہوم کو سمجھنے اور اس پر عمل کرنے کی کوشش کرینگے اور اسلام کے لئے جو کچھ خرچ کرنا پڑیگا کرینگے۔ اور جب تک خرچ کرنا پڑیگا کرینگے۔ کیونکہ جب تک اس بات میں خوشی محسوس نہ ہو کہ اسلام کے لئے سب کچھ قربان کر دیا جائیگا۔ اس وقت تک ایمان کامل نہیں ہوسکتا۔ مَیں دُعا کرتا ہوں کہ خدا کرے ایسا ہی ہو۔

موجودہ مالی مشکلات کو دور کرنے کے لئے فی الحال یہ تجویز کی گئی ہے کہ چونکہ آمد کے بجٹ سے چالیس ہزار خرچ زیادہ ہے اس لئے چندہ خاص مستقل طور پر اس وقت تک مقرر کر دیا جائے جب تک یہ خرچ معمولی آمد سے پورا نہ ہو جائے۔ یعنی ہماری جماعت کے لوگ اپنی ایک ماہ کی آمد کا ۴۰ فیصدی ہر سال عام چندہ کے علاوہ ادا کرتے رہیں۔ مَیں اس سے نہیں ڈرتا کہ کچھ لوگ

کمزور ہوں گے جو اس بوجھ کو اٹھانے کے لئے تیار نہ ہونگے ایسے کمزور دوسروں کے لئے طاقت کا باعث نہیں ہوا کرتے بلکہ کمزور کرنے کا موجب ہوتے ہیں۔ وہ ترقی کرنے والوں کے راستہ میں پتھر ہوتے ہیں۔ان کا ہٹ جانا ہی مفید ہوتا ہے۔پس اگر اس وجہ سے کچھ لوگ پیچھے ہٹیں گے تو ہٹ جائیں۔ ان سے ہمیں کوئی نقصان نہ ہوگا بلکہ ہماری کمر ان کے بوجھ سے ہلکی ہو جائے گی۔

پس اس وقت تک کہ معمولی آمد ہمارے اخراجات کو پورا کرنے کے لئے کافی ہو جائے سالانہ ایک ماہ کی آمد کا ۴۰ فیصدی چندہ خاص دینا ہوگا۔آپ لوگ یہ مت خیال کریں کہ یہ کام کس طرح چلیگا۔مَیں اِسوقت ان کو مخاطب نہیں کرتا جو قوی ہیں بلکہ ان کو مخاطب کرتا ہوں جو کمزور ہیں اور جو ہمارے لئے بوجھ بنے ہوئے ہیں۔ کہ یہ خدا تعالیٰ کا سلسلہ ہے۔مَیں نے یہ جگہ اُسوقت دیکھی تھی جب یہ ویران پڑی تھی۔ اور وہ وقت بھی دیکھا ہے۔ جب حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام سیر کے لئے نکلتے تو ایک آدھ آدمی آپ کے ساتھ ہوتا تھا۔اور وہ بھی آپ کا ملازم۔مگر آج خود حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نہیں بلکہ آپ کے غلام کی یہ حالت ہے کہ ہجوم میں سے چور کی طرح بھاگ کر نکلتا ہے تا کہ ہجوم میں گھر نہ جائے۔ پس وہ خدا جو ایک سے بڑھا کر اتنے آدمی کر سکتا ہے اور جو لاکھوں روپیہ چندہ بھیج سکتا ہے وہ آئندہ بھی اِس سلسلہ کو بڑھائیگا۔اس وجہ سے مَیں ایک منٹ کے لئے بھی یہ خیال نہیں کر سکتا کہ یہ سلسلہ ترقی نہیں کریگا۔ اور دُنیا کی کوئی روک اس کے رستہ میں حائل ہو جائیگی۔ پس مَیں سوائے ان لوگوں کے جن کے دلوں پر مہر لگ چکی ہے کہتا ہوں خدا کے فضل سے یہ سلسلہ ان مشکلات سے نکلے گا اور انہی کے ہاتھ سے خدا تعالیٰ فتح و نصرت دیگا جو آج کمزور سمجھے جاتے ہیں اور جو واقعہ میں کمزور ہیں بھی۔ دیکھو بہادر جرنیل وہی سمجھا جاتا ہے جو معمولی سپاہیوں کو لیتا اور ان کے ذریعہ عظیم الشان کام کر کے دکھاتا ہے۔مَیں اپنے لئے نہیں کہتا۔ کیونکہ یہ سلسلہ خدا کا سلسلہ ہے اسلئے جس کے سپرد بھی خدا تعالیٰ اس سلسلہ کا انتظام کریگا اُسے ایسی قوّت اور طاقت بخشے گا کہ آج جو کمزور نظر آتے ہیں انہیں کے ہاتھوں فتح حاصل ہوگی۔انہیں اپنے نفسوں پر بدظنی ہو تو ہو مگر مجھے حسن ظنی ہے اور انشاءاللہ تعالیٰ وہ

دن آئے گا جب میری حسن ظنی پوری ہوکر رہے گی۔

پھر مَیں کہتا ہوں۔ اگر مالی اخراجات ہماری جماعت کے لوگوں پر بوجھ ہیں تو دوست کیوں تبلیغ پر خاص زور نہیں دیتے۔ مَیں نے انہیں کب روکا ہے کہ وہ جماعت کو نہ بڑھائیں۔ وہ کیوں نہیں جلدی جماعت بڑھاتے تا کہ یہ بوجھ کم ہو جائے۔ یہ ہمارا قصور نہیں بلکہ ان کا اپنا ہی قصور ہے۔ آپ لوگ اگر جمات بڑھائیں تو مالی بوجھ آپ ہی کم ہو جائے۔ گو اصل بات تو یہ ہے کہ مومن کا یہ بوجھ مرنے کے بعد ہی کم ہوتا ہے زندگی میں نہیں ہوسکتا۔

اس موقعہ پر مَیں دوستوں کو یہ خوشخبری بھی سُنانا چاہتا ہوں کہ اِس سال دو اور ملکوں میں ہماری جماعتیں قائم ہوگئی ہیں۔ جن میں ایک تو وہ ملک ہے جہاں عیسائیوں نے سو سال تک تبلیغ کی تھی تب جا کر انہیں کچھ کامیابی ہوئی تھی۔ مگر ہمارے تبلیغ کو چند دن میں ۱۵-۱۶ سعید روحیں مل گئی ہیں۔ وہ سماٹرا اور جاوا کا علاقہ ہے۔ دوسرا وہ مُلک ہے جس کا نام لینے سے میرے خون میں جوش اور حرکت پیدا ہو جاتی ہے وہ ایران کا ملک ہے۔ ایران وہ ملک ہے جس سے حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کی نسبت ہے۔ کیونکہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا ہے کہ مسیح فارسی النسل ہوگا۔ ایران کے دارالخلافہ میں بیس کے قریب آدمی احمدیت میں داخل ہو چکے ہیں۔ اور اس کے متعلق یہ اور بھی خوشی کی بات ہے کہ وہاں ہمارے جو مبلغ گئے ہیں انہیں ہم کوئی خرچ نہیں دیتے۔ وہ شاہزادہ عبدالمجید صاحب ہیں جو شاہ شجاع کی اولاد سے ہیں اور لدھیانہ کے رہنے والے ہیں۔ انہوں نے خدمتِ دین کے لئے زندگی وقف کی تھی۔ مَیں نے انہیں ایران بھیج دیا۔ ان کے تازہ خط سے معلوم ہوا ہے کہ کئی ایسے لوگ جو بارسوخ اور معزز ہیں اور جن کا ہزاروں آدمیوں پر اثر ہے سلسلہ کے متعلق تحقیق کر رہے ہیں۔

ایک اَور بات مَیں سُنانا چاہتا ہوں تا کہ معلوم ہو کہ خدا تعالیٰ ہمارے سلسلہ کی کس طرح تبلیغ کر رہا ہے۔ پچھلے سال ترکستان میں کردوں کی جو بغاوت ہوئی تھی وہ ایک شخص شیخ سعید کے ماتحت ہوئی تھی۔ وہ اتنی بڑی بغاوت تھی کہ اس کے فرو کرنے کے لئے ترکوں کو ۳ لاکھ آدمی جمع کرنے پڑے تھے اور عصمت پاشا وزیر اعظیم جیسے مشہور آدمی کو ان کا کمانڈار مقرر کیا گیا تھا۔ شیخ

سعید جب پکڑے گئے اور ان کا بیان لیا گیا تو انہوں نے کہا اگر فلاں واقعہ نہ ہوتا تو مَیں کبھی بغاوت میں شامل نہ ہوتا۔ کیونکہ مَیں ارادہ کر چکا تھا کہ مَیں ہندوستان چلا جاؤنگا اور جماعت احمدیہ میں شامل ہوکر تبلیغِ اسلام کرونگا۔ اگرچہ ان کو ترکوں نے قتل کرادیا اور وہ اپنے اس ارادہ کو پورا نہ کر سکے۔ مگر اس سے معلوم ہوتا کہ اس ملک کے بڑے بڑے آدمیوں نے احمدیت قبول کی ہوئی ہے۔ مجھے افسوس ہے کہ یہ صاحب سلسلہ سے پوری طرح واقف نہ تھے ورنہ حکومت کے خلاف بغاوت میں کبھی شامل نہ ہوتے۔

مَیں نے مالی مشکلات کی وجہ سے کہا ہے کہ اسوقت تک کوئی نیا کام نہ بڑھایا جائے جبتک حالت درست نہ ہوا۔ امریکہ کے مشن پر اب خرچ کم کر دیا گیا ہے اور ہندوستان میں آئندہ سال سے زیادہ کوشش کی جائے گی تا کہ یہاں کی جماعت زیادہ بڑھے اور زیادہ بوجھ اُٹھا سکے مگر جہاں یہ ضروری ہے کہ ہماری جماعت زیادہ قربانی کرے وہاں یہ بھی ضروری ہے کہ جن سامانوں کے ذریعہ وہ قربانی کرسکتی ہے ان کو بڑھایا جائے۔ انگریزی میں مثل ہے کہ سونے کا انڈا لینے کے لئے مرغی کو مار نہ ڈالنا چاہئے۔ اس وجہ سے ضروری ہے کہ جماعت کی مالی اصلاح اور ترقی کے لئے کوشش کی جائے۔ اس کے لئے ایک تو یہ ضروری ہے کہ جماعت کے لوگ ایک دوسرے کا تعاون کریں مختلف مقامات پر ٹرنک سازی، سیاہی سازی، تنگیاں بنانا، آزار بند بنانا، کلاہ وغیرہ مختلف قسم کی صنعتیں جاری ہیں۔ اگر مختلف جگہ کے احمدی تاجر احمدی صناعوں سے اشیاء خریدیں تو ان کی بکری وسیع ہوسکتی ہے۔ اور ان کی آمد زیادہ ہونے کی وجہ سے سلسلہ کو بھی فائدہ پہنچ سکتا ہے۔ پس احمدی تاجر احمدی صناعوں سے مال خریدیں اور احمدی گاہک احمدی دکانداروں سے خریدیں تو اس طرح بھی بہت فائدہ ہوسکتا ہے۔ ہمارے مبلغوں کو بھی اس کام میں مدد دینی چاہئے۔ جہاں جائیں دیکھیں کہ کونسی صنعت کوئی احمدی کرتا ہے۔ اور جب دوسری جگہ جائیں تو وہاں کے لوگوں کو بتائیں کہ فلاں مال فلاں احمدی بناتا ہے اس سے خریدا جائے۔

میرے نزدیک اس پہلو میں ترقی دینے کا ایک آسان طریق یہ بھی ہے کہ مجلس مشاورت کے وقت ایک نمائش بھی ہو جایا کرے جس میں احمدی صناع اپنی بنائی ہوئی چیزیں لا کر رکھیں تا کہ

دوست واقف ہو جائیں کہ فلاں چیز فلاں جگہ سے مل سکتی ہے۔ اور پھر ضرورت کے وقت وہاں سے منگا لیں۔ پھر احمدیوں کو چاہئے کہ بیکار احمدیوں کو ملازم کرانے کی کوشش کریں۔ بعض دوستوں نے اس بارے میں بڑی ہمت دکھائی ہے مگر اکثر سُستی کرتے ہیں۔ اسی طرح جماعت کے لوگوں کو چاہئے تجارتی شہروں میں جا کر تجارت اور صنعت سیکھیں۔

اسی طرح ایک ضروری امر پسماندگان کی مدد ہے۔ جب ہم کہتے ہیں کہ سب کچھ دین کے لئے قربان کر دو تو جو لوگ اس پر عمل کرتے ہیں ان کے فوت ہونے پر ان کے پسماندگان کے لئے کچھ نہیں بچتا۔ ایسے حاجتمندوں کے لئے ایک فنڈ ہونا ضروری ہے۔ جس میں چندہ دینا لازمی نہ ہو بلکہ مرضی پر ہو۔ اور اس کے لئے ایسا قانون بنا دیا جائے کہ جو اتنا چندہ دے اسے اتنے عرصہ کے بعد اتنی رقم بالمقطع دی جائیگی یا اگر فوت ہو جائے تو پسماندگان کو اتنی رقم ادا کر دی جائے۔ اگر کسی ایسے فنڈ کا انتظام ہو جائے تو پسماندگان کا انتظام ہو سکتا ہے۔ اسکے متعلق مَیں تفصیلی طور پر اسوقت نہیں بیان کر سکتا۔ میرا ارادہ ہے کہ مجلس مشارت میں اسے پیش کیا جائے اور اسے ایسے رنگ میں رکھا جائے کہ سود نہ رہے۔ انشورینس نہ ہو اور کام بھی چل جائے۔ مثلاً یہی فیصلہ ہو کہ اس عمر تک پسماندگان کو گذارا دیا جائے گا۔ یا یہ کہ بچوں کو اس قدر تعلیم دلائی جائے گی۔

اس قسم کی تحریکات بھی جماعت کی مالی حالت کی درستی کے لئے ضروری ہیں جن کے متعلق تجاویز سوچی جائیں گی تا کہ شرعی لحاظ سے ان میں کوئی نقص نہ ہو اور پسماندگان کے گذارہ کا کوئی معقول انتظام ہو سکے۔ جس سے ہماری جماعت کے لوگوں کو ایک گونہ اعتماد حاصل ہو سکے کہ ان کے بعد ان کی اولاد خطرہ میں نہ ہوگی۔ گو مومن کا اعتماد تو خدا پر ہی ہوتا ہے۔

اب مَیں وہ مضمون شروع کرتا ہوں جس کے متعلق مَیں پہلے اشارہ کر چکا ہوں۔ میرے دل میں مدّت سے یہ خواہش تھی کہ یہ مضمون بیان کروں۔ یہ ایسا اہم مضمون ہے کہ ہر انسان کے دل میں اس کے متعلق سوال پیدا ہوتا ہے اور بے شمار لوگوں نے اسکے متعلق مجھ سے پوچھا ہے اور اسکے بارے میں نسخہ دریافت کیا ہے۔ وہ سوال یہ ہے کہ وہ کونسے ذرائع ہیں جن پر عمل کر کے انسان گناہوں سے پاک ہو جائے اور نفس میں نیکیاں پیدا ہو جائیں۔ عام طور پر اس کا یہ جواب

دیا جاتا ہے کہ نیکی کرو، نیکی کرو اور گناہوں سے بچو، گناہوں سے بچو۔ لیکن جیسا کہ ہر ایک شخص کے تجربہ میں آیا ہے بہت سے لوگ کہتے ہیں کہ ہم نے قرآن کریم کو پڑھا، احادیث کو پڑھا، حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کی کتابوں کو پڑھا اور گناہوں سے بچنے کی کوشش کی۔ مگر ہم کلی طور پر نہیں بچ سکے، نیکی کرنے کے لئے ہم نے کوشش کی مگر کامیاب نہ ہو سکے۔ اب بتاؤ ہمارا کیا علاج ہے۔ اسلئے ضروری ہے کہ اس نقطہ سے بحث کی جائے کہ کس طرح انسان کی اس کمزوری کو دور کیا جائے کہ وہ باوجود ارادہ اور کوشش کے گناہوں سے بچنے میں کامیاب نہیں ہوسکتا۔ جب مَیں نے اِس مضمون کے متعلق نوٹ لکھنے شروع کئے تو خیال کر کے کہ یہ مضمون عرفانِ الٰہی کے مضمون کے بعض حصّوں سے ٹکرائیگا۔ اس تقریر کا مطالعہ کیا۔ اس وقت مجھے معلوم ہوا کہ مَیں نے اس تقریر میں وعدہ کیا ہوا تھا کہ یہ مضمون بیان کرونگا۔ یہ خدا تعالیٰ کا فضل ہے کہ اب مَیں اس وعدہ کو پورا کرنے لگا ہوں۔

پھر جب مَیں اس مضمون پر غور کرنے لگا تو ایک پُرانی اور بہت پُرانی رؤیا مجھے یاد آ گئی۔ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کی وفات کے ایک آدھ ماہ بعد مَیں نے یہ رؤیا دیکھی تھی۔ اور اسوقت اس کی کوئی تعبیر نہ سوجھتی تھی۔ رؤیا یہ تھی کہ ایک مصلّٰی ہے جس پر مَیں نماز پڑھ کے بیٹھا ہوں۔ میرے ہاتھ میں ایک کتاب ہے جس کے متعلق مجھے بتایا گیا ہے کہ وہ شیخ عبد القادر صاحب جیلانی کی ہے اور اس کا نام منہاج الطالبین ہے یعنی خدا تعالیٰ تک پہنچنے والوں کا رستہ۔ مَیں نے اس کتاب کو پڑھ کر رکھ دیا کہ پھر یکدم خیال آیا کہ یہ کتاب حضرت خلیفہ اوّل رضی اللہ عنہ کو دینی ہے اسلئے مَیں اسے ڈھونڈنے لگا ہوں مگر وہ ملتی نہیں۔ ہاں اسے ڈھونڈتے ڈھونڈتے ایک اَور کتاب مل گئی۔ اس وقت میری زبان پر یہ الفاظ جاری ہو گئے۔ **وما یعلم جنود ربّک الّا ھو** اور تیرے رب کے لشکروں کو سوائے اُسکے اور کوئی نہیں جانتا۔

اس کے بعد مَیں نے اس خیال سے کہ اگر شیخ عبد القادر صاحب جیلانی کی کوئی کتاب اس نام کی ہو تو اُسے تلاش کروں۔ حضرت خلیفۃ المسیح اوّل رضی اللہ عنہ سے پوچھا تو آپ نے فرمایا۔ انکی اِس نام کی تو کوئی کتاب نہیں۔ البتہ غنیّۃ الطالبین نام کی کتاب ہے۔ پھر معلوم ہوا کہ اِس نام

کی کسی اور کی کتاب بھی نہیں ہے۔ پھر خیال آیا کہ ممکن ہے کہ کسی وقت مجھے ہی اس نام کی کتاب لکھنے کی توفیق ملے۔ اور عبدالقادر سے مراد یہ ہو کہ اس میں جو کچھ لکھا جائے وہ میرے دماغ کا نتیجہ نہ ہو بلکہ خدا تعالیٰ کی سمجھائی ہوئی باتیں ہوں اس وجہ سے مَیں نے اس مضمون کا نام منہاج الطالبین رکھا ہے۔

اس مضمون کے جن حصّوں کا تعلق عرفان الٰہی اور مسئلہ نجات سے ہے ان میں سے بعض کو تو چھوڑ دوں گا اور جن کا تسلسل مضمون کے لئے ذکر کرنا ضروری ہوگا ان کو مختصراً بیان کروں گا۔ اور اصل بات تو یہ ہے کہ پہلے اس مضمون کے علمی پہلو بیان ہوئے۔ اب مَیں عملی پہلو بیان کرونگا۔

اس ضروری اور اہم مسئلہ پر غور کرتے ہوئے ہم دیکھتے ہیں کہ انسانی پیدائش کی غرض کیا ہے۔ وہ خدا تعالیٰ نے خود بیان کردی ہے۔ فرماتا ہے **مَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْن** کہ ہم نے انسان کو ایک ہی کام کے لئے پیدا کیا ہے اور وہ یہ کہ عبد بن جائے۔ عبودیت کے معنے عربی میں تذلل کے ہیں اور تذلل کا یہ مفہوم ہے کہ جو دوسرے کا نقش قبول کرے۔ تو عبد کے معنے ہیں حکومت تسلیم کر لینا۔ نقش تسلیم کر لینا، اور خدا تعالیٰ فرماتا ہے سوائے اس غرض کے انسان کو اور کسی غرض کے لئے نہیں پیدا کیا گیا کہ میرے نقش کو قبول کرے۔ جب انسان کی زندگی کا یہ مقصد ہے تو ہم اس وقت تک اسے پورا نہیں کر سکتے جب تک خدا تعالیٰ کی صفات کو اپنے اندر جذب نہ کر لیں۔

خدا تعالیٰ نے انبیاء کو بھی اس غرض کے لئے بھیجا۔ چنانچہ فرماتا ہے: **رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيْهِمْ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ**o (۲-۱۳۰)

حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام دُعا فرماتے ہیں۔ اے ہمارے ربّ ان میں ایسا رسول بھیجیو جو ان میں تیری آیات پڑھے۔ انہیں شریعت سکھائے، حکمت بتائے اور پاک کرے تو غالب اور حکمت والا ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ رسول کی یہ غرض ہوتی ہے کہ ایمان مضبوط کرے۔ علم کو مضبوط کرے۔

شریعت سکھائے اور حکمت سکھائے، یعنی علم کے بعد عمل سکھائے۔ اور اس طرح پاک کر کے خدا تعالیٰ کی مقدس مجلس میں بیٹھنے کے قابل بنا دے۔

ہماری جماعت کے لئے یہ سوال کوئی معمولی سوال نہیں بلکہ ان کی زندگی اور موت کا سوال ہے۔ کیونکہ اس وقت خدا کا ایک نبی آیا ہے جسے ہم نے قبول کیا ہے اور جس نے خدا کی آیات پڑھ کر ہمیں سُنائی ہیں۔ اگر اس کو مان کر بھی ہم گندے رہے تو اس کو ماننے کا کیا فائدہ ہوا۔ مولوی بُرہان الدین صاحب جہلمی بہت مخلص احمدی تھے۔ حضرت مسیح موعود ایک دفعہ بیان فرما رہے تھے کہ مومن کے یہ یہ درجات ہونے چاہئیں۔ تقریر ختم ہونے کے بعد مولوی صاحب چیخیں مار کر رو پڑے اور حضرت مسیح موعودؑ سے کہنے لگے۔ پہلے ہم وہابی ہوئے اور ہم نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی باتوں کی اشاعت کرنے کی وجہ سے ماریں کھائیں۔ پھر آپ آئے اور ہم نے آپ کو مانا اس وجہ سے مخالفین سے ماریں کھائیں۔ پتھر کھائے نقصان اٹھائے (مولوی صاحب موصوف یہ باتیں پنجابی میں کہہ رہے تھے جو مَیں نے اُردو میں بیان کی ہیں۔ لیکن اگلا فقرہ مَیں اُردو میں بیان نہیں کر سکتا اس لئے پنجابی میں ہی دہراتا ہوں۔ کہنے لگے۔ مگر باوجود اس قدر تکالیف اُٹھانے کے مَیں دیکھتا ہوں کہ مَیں ''فیروی جھڈو دا جھڈو ہی رہیا''، یعنی کسی کام کا نہ بنا) پس اگر ایک نبی کو مان کر بھی وہی بات ہو کہ ہم نکمے کے نکمے ہی رہیں۔ تو ہمیں کیا فائدہ ہوا۔ ہمارے اندر تو ایسی تبدیلی اور ایسا تغیر ہونا چاہئے کہ ہمیں محسوس ہو کہ ہم نے زندہ انسان کے ہاتھ میں اپنا ہاتھ دیا ہے۔ بلکہ یہ محسوس ہو کہ ہم نے خدا تعالیٰ کے ہاتھ میں اپنا ہاتھ دیا ہے۔ ورنہ اگر ہم اس میں کامیاب نہ ہوئے تو گویا ہم نے کچھ نہ کیا۔ دیکھو حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام ہم سے کیا خواہش رکھتے اور ہمیں کتنا خطرناک ڈراتے ہیں۔ آپ تزکیۂ نفس کی نصیحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں: تزکیۂ نفس اسے کہتے ہیں کہ خالق و مخلوق دونوں طرف کے حقوق کی رعایت کرنیوالا ہو۔ خدا تعالیٰ کا حق یہ ہے کہ جیسا زبان سے وحدہٗ لاشریک اسے مانا جائے ایسا ہی عملی طور سے اسے مانیں اور مخلوق کے ساتھ برابر نہ کیا جائے۔ اور مخلوق کا حق یہ ہے کہ کسی سے ذاتی طور پر بُغض نہ ہو۔ تعصّب نہ ہو۔ شرارت انگیزی نہ ہو۔ ریشہ دوانی نہ ہو۔ مگر یہ مرحلہ دور ہے۔ ابھی تمہارے

معاملات آپس میں بھی صاف نہیں۔ گلہ بھی ہوتا ہے۔ غیبتیں بھی ہوتی ہیں۔ ایک دوسرے کے حقوق بھی دباتے ہیں۔ پس خدا تعالیٰ چاہتا ہے کہ جب تک تم ایک وجود کی طرح بھائی بھائی نہ بن جاؤ گے۔ اور آپس میں بمنزلہ اعضاء نہ بن جاؤ گے تو فلاح نہ پاؤ گے۔ انسان کا جب بھائیوں سے معاملہ صاف نہیں تو خدا سے بھی نہیں۔ بیشک خدا کا حق بڑا ہے مگر اس بات کو پہچاننے کا آئینہ کہ خدا تعالیٰ کا حق ادا کیا جا رہا ہے یہ ہے کہ مخلوق کا حق ادا کر رہا ہے۔ یا نہیں۔ جو شخص اپنے بھائیوں سے معاملہ صاف نہیں رکھتا وہ خدا سے بھی صاف نہیں رکھتا۔ یہ بات سہل نہیں یہ مشکل بات ہے۔ سچی محبت اور چیز ہے اور منافقانہ اَور۔ دیکھو مؤمن کے مؤمن پر بڑے حقوق ہیں۔ جب وہ بیمار پڑے تو عیادت کو جائے اور جب مَرے تو اس کے جنازہ پر جائے۔ ادنیٰ ادنیٰ باتوں پر جھگڑا نہ کرے بلکہ درگذر سے کام لے۔ خدا کا یہ منشاء نہیں کہ تم ایسے رہو۔ اگر سچی اخوت نہیں تو جماعت تباہ ہو جائیگی۔'' بدر ۱۹۰۸ء نمبر ا صفحہ ۱۲، استغفر اللہ ربی من کل ذنبٍ واتوب الیک۔

یہ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کی نصائح ہیں تقویٰ کے متعلق۔ پس اپنی زندگی کے مقصد کو پورا کرنے کے لئے رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی بعثت کے مقصد کو پورا کرنے کے لئے اور حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کی بعثت کے مقصد کو پورا کرنے کے لئے ہمارا فرض ہے کہ اپنے اندر تقویٰ پیدا کرنے کی کوشش کریں۔

اب مَیں یہ تعریف بیان کرتا ہوں کہ انسان کامل کون ہوتا ہے۔ جیسے طبّ کے لحاظ سے یہ دیکھا جاتا ہے کہ تندرست آدمی کون ہے۔ اسی طرح رُوحانیت کے لحاظ سے ہم معلوم کرتے ہیں کہ انسان کامل کون ہوتا ہے۔

انسان کامل بننے کے لئے سب سے ضروری بات یہ ہے کہ انسان کا تعلق مخلوق سے بھی درست ہو اور خدا تعالیٰ سے بھی درست ہو۔ یہ دونوں باتیں ضروری ہیں جو حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے انسان کامل کے لئے قرار دی ہیں۔ انسانوں سے تعلق کا درست رکھنا بھی دو حصوں میں تقسیم ہو جاتا ہے۔ (ا) یہ کہ انسان کا اپنے نفس سے تعلق درست ہو چنانچہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم فرماتے ہیں: **ولنفسک علیک حقّ.** تیرے نفس کا بھی تجھ پر حق ہے۔

(۲) یہ کہ دوسری مخلوق سے اس کا تعلق درست ہو۔اپنے نفس کے متعلق جو تعلیم ہے وہ پھر دو حصوں میں تقسیم ہو جاتی ہے۔(ا) انسان ان امور سے مجتنب رہے کہ جو اسکے دل کو خراب کرنے والے ہیں (۲) ان امور پر عمل کرے جن سے دل پاک ہوتا ہے۔دوسرے حصہ کی بھی تین شاخیں ہیں یعنی (ا) بنی نوع انسان سے بحیثیت افراد انسان کا تعلق درست ہو (۲) اسکے تعلقات بنی نوع انسان سے بحیثیت جماعت درست ہوں یعنی قانونِ ملکی کے لحاظ سے دوسروں کے ساتھ تعاون کرے (۳) اس کے تعلقات انسانوں کے علاوہ خدا تعالیٰ کی دوسری مخلوق سے بھی درست ہوں۔

پھر آگے ان کی دو شاخیں ہیں (ا) ان امور سے مجتنب رہے جو بنی نوع انسان یا دوسری مخلوق کے ساتھ اس کے تعلق کو خراب کرتے ہوں (ب) ان امور پر کاربند ہو جن سے بنی نوع انسان یا دوسری مخلوق سے اس کا تعلق احسان پر مبنی ہو جائے۔

پھر خدا تعالیٰ سے تعلق درست رکھنے کے بھی دو حصے ہیں (ا) ان افعال سے اجتناب کرے کہ جو اس تعلق کو توڑنے والے ہیں (۲) ان افعال پر کاربند ہو جو خدا تعالیٰ کے ساتھ تعلق کو بڑھاتے ہیں۔

اِس تقسیم کے بعد مَیں یہ بتاتا ہوں کہ دین اور مذہب کے کیا معنے ہیں کیونکہ ان سب باتوں کا خلاصہ دین ہے۔اور اب مَیں یہ بتاتا ہوں کہ دین کی تشریح کیا ہے۔یہ نکتہ یاد رکھنے کے قابل ہے کہ دین دو شقوں میں منقسم ہے۔یعنی دین کے دو حصے ہیں (ا) اخلاق (۲) روحانیت۔مَیں نے بہت لوگوں کو دیکھا ہے جنہیں یہ دھوکہ لگا ہے کہ وہ اخلاق کو ہی دین سمجھتے ہیں۔جس کے اخلاق اچھے ہوں اُس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ بڑا نیک ہے حالانکہ اس کے متعلق ہم یہ تو کہہ سکتے ہیں کہ اس کا آدھا حصہ درست ہے مگر اسے نیک یعنی دیندار اور متقی نہیں کہہ سکتے۔

اخلاق کی تعریف

انسان کے اعمال کا وہ حصہ جو بنی نوع انسان سے تعلق رکھتا ہے اخلاق کہلاتا ہے۔اور وہی

معاملہ جب خدا تعالیٰ سے کیا جائے تو اسے روحانیت کہتے ہیں۔ اگر کوئی انسان بندوں سے جھوٹ بولتا ہے تو وہ بد اخلاق ہے اور اگر خدا سے جھوٹ بولتا ہے تو اس کا یہ مطلب ہے کہ اس کی روحانیت مردہ ہوگئی ہے۔ اور جب کسی کے دونوں پہلو درست ہوں تب ہی وہ دیندار اور متقی کہلا سکتا ہے۔ پس جب اخلاق مطابق شریعت کئے جائیں تو وہ روحانیت کے ساتھ مل کر دین کہلاتے ہیں۔ لیکن جب وہی افعال بغیر رُوحانیت سے اشتراک کے تمدّن کے طور پر کئے جائیں تو ایسے انسان کے متعلق کہتے ہیں۔ بڑا با اخلاق ہے۔

مَیں پہلے اخلاق کو لیتا ہوں پھر روحانیت کو بیان کرونگا۔ لیکن یہ بات یاد رکھنی چاہئے کہ اخلاق اور روحانیت میں فرق صرف یہی ہے کہ ہماری طاقتوں کا ظہور انسانوں کے ساتھ معاملات میں اخلاق کہلاتا ہے اور انہی طاقتوں کا خدا تعالیٰ کے متعلق ظہور روحانیت کہلاتا ہے۔ اسلئے جہاں مَیں اخلاق بیان کرونگا وہاں ساتھ ہی روحانیت کا بھی پتہ لگ جائے گا۔ اور جہاں فرق بتانے کی ضرورت ہوگی وہاں فرق بیان کر دوں گا۔

اخلاق کے مسئلہ پر غور کرنے سے پہلے ہمیں یہ دیکھنا چاہئے کہ خُلق کیا چیز ہے۔ اسکے متعلق اسلام کے سوا سب مذہبوں نے اور فلسفیوں نے لغزشیں کھائی ہیں۔ اور اسکی عجیب عجیب تعریفیں کی ہیں۔ مثلاً (۱) بعض کے نزدیک خُلق اس گہری جڑ رکھنے والے ملکہ کا نام ہے جس سے انسانی اعمال بلافکر و رویہ آپ ہی آپ سرزد ہوتے ہیں۔ یا جس کے ماتحت انسان بلافکر و رویہ کسی فعل کے کرنے سے انکار کر دیتا ہے۔ (۲) بعض کے نزدیک خُلق وہ نیک مادہ ہے کہ جو انسان کے اندر خدا کی ذات پر دلالت کرنے کے لئے پیدا کیا گیا ہے۔ (۳) بعض کے نزدیک خُلق وہ مادہ ہے جو لمبے تجربہ کے بعد انسان میں پیدا ہوگیا ہے اور اب ورثہ کے طور پر انسانوں میں آتا ہے۔ یورپ کے فلاسفر اسی نتیجہ پر پہنچے ہیں۔

میرے نزدیک خلق اس حالت کا نام ہے جبکہ طبعی تقاضے قوت فکر کے ساتھ ملا دیئے جائیں اور ان تقاضوں سے کام لینے والی ہستی مقتدر ہو۔ یعنی چاہے تو ان سے کام لے اور چاہے تو ترک کر دے۔ اگر یہ افعال ایسے وجود سے ظاہر ہوں جس میں قوتِ فکر نہ ہو تو وہ طبعی تقاضے کہلاتے

ہیں جیسے حیوانوں میں ہوتا ہے۔ حیوان محبت اور پیار کرتے ہیں مگر ان کو با اخلاق نہیں کہہ سکتے۔ بلکہ طبعی تقاضے کہتے ہیں۔ پھر اگر اس قسم کے افعال ایسے وجودوں سے ظاہر ہوں جنہیں خاص رنگ میں بنایا گیا ہو جیسے نباتات یا جمادات، تو انہیں ظہور قدرت کہیں گے۔

مضمون کا یہ حصہ مشکل ہے۔ اگر بعض دوست اسے نہ سمجھ سکیں تو جب یہ کتاب کی شکل میں چھپ جائیگا اُس وقت سمجھ جائیں گے۔ مگر اسکے بغیر چونکہ مضمون کا اگلا حصہ نہیں چل سکتا اس لئے بیان کرتا ہوں۔ اگلا حصہ آسان ہے وہ سب دوست سمجھ سکیں گے۔

مَیں اخلاق کی تعریف بیان کر چکا ہوں۔ اخلاق وہ افعال ہیں جو ایسے لوگوں سے صادر ہوں جن میں سوچنے اور فکر کرنے کی طاقت ہو اور کام کرنے یا نہ کرنے کی قابلیت پائی جائے۔

اب مَیں اخلاقِ حسنہ کی تعریف بیان کرتا ہوں۔ اخلاق حسنہ کی تعریفیں بھی مختلف لوگوں نے مختلف کی ہیں۔ چنانچہ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اخلاق حسنہ انسانی طاقتوں کے عقل کے ماتحت استعمال کرنے کا نام ہے۔

(۲) بعض کے نزدیک اخلاق حسنہ وہ افعال ہیں جو انسان کو حقیقی خوشی پہنچاتے ہیں۔

(۳) بعض کے نزدیک اخلاق حسنہ وہ افعال ہیں جن میں ایثار سے کام لیا گیا ہو یعنی اپنا نقصان کر کے دوسروں کو فائدہ پہنچایا گیا ہو۔

(۴) بعض کہتے ہیں کہ اخلاق حسنہ وہ افعال ہیں جو عقل کی روشنی اور اس کے انتظام کے ماتحت ذاتی نفع کی غرض سے ایثار کے طور پر کئے جائیں۔

(۵) مسلمان صوفی کہتے ہیں جو افعال عقل اور شریعت کے ماتحت کئے جائیں وہ اخلاق حسنہ ہوتے ہیں۔

امام غزاؔلی نے اخلاق حسنہ کی یہی تعریف کی ہے لیکن یہ تعریف میرے نزدیک کچھ اصلاح کی محتاج ہے، اور وہ اصلاح یہ ہے کہ وہ افعال عقل اور شریعت کے مطابق بھی ہوں اور ساتھ ہی یہ بات بھی پائی جائے کہ ان کا مرتکب اپنی مرضی، ارادہ اور مقدرت سے ان افعال کو کرے۔ اگر یہ شرط نہیں پائی جاتی تو وہ اخلاق حسنہ نہیں کہلا سکتے۔ مثلاً اگر کوئی شخص نیم خوابی کی حالت میں کسی کو

ایک روپیہ دے دے اور جاگتے ہوئے صدقہ وخیرات سے پرہیز کرے تو اس کا نیم خوابی میں صدقہ کرنا اچھا خُلق نہیں کہلا ئیگا۔ کیونکہ اس کا یہ فعل ارادہ کے ماتحت نہیں ہوگا۔ پس وہ افعال اخلاق حسنہ ہوتے ہیں جو شریعت اور عقل کے ماتحت ارادہ سے کئے جائیں۔ پھر ایک یہ شرط بھی ہے کہ وہ اعمال خدا تعالیٰ کی صفات کے مطابق ہوں خلاف نہ ہوں۔ یہی تعریف صحیح ہے۔ کیونکہ خوبی وہی ہوسکتی ہے جو نقص اور غلطی سے پاک ہو۔ اور کوئی شئے ہماری عقل کے پاک کہنے سے پاک نہیں ہوسکتی۔ بلکہ خدا تعالیٰ کی صفات کی شہادت سے جو چیز پاک ہے وہی حقیقی طور پر پاک ہوسکتی ہے۔ اور خوبی کہلانے کی مستحق ہے۔ کیونکہ صرف خدا تعالیٰ کی ذات ہی کامل طور پر بے عیب ہے۔

اب مَیں اخلاق کے منبع کو بیان کرتا ہوں کہ اخلاق کہاں سے پیدا ہوتے ہیں مختلف لوگوں نے مختلف سرچشمے بتائے ہیں۔ بعض کہتے ہیں اخلاق کا منبع قوتِ فکریہ یعنے عقل، غضب اور شہوت ہیں عقل کام کرتی ہے جیسے سوار کام کرتا ہے۔ اور غضب وشہوت دوگھوڑے ہیں۔ عقل کا سوار جب ان دوگھوڑوں کو درست چلاتا ہے تو خلق پیدا ہوتا ہے۔ اور اگر سوار غلطی کرے تو بدخُلقی پیدا ہوتی ہے۔ محی الدین ابن عربی اس قوتِ فکر کا نام نفسِ ناطقہ رکھتے ہیں۔

ان کا دعویٰ ہے کہ تمام اخلاق ان تینوں مادوں کے ملنے سے پیدا ہوتے ہی۔ یعنی عقل اور شہوت کے ملنے سے۔ یا عقل اور غصہ کے ملنے سے یا تینوں کے ایک جگہ جمع ہو جانے سے وہ عقل کو مرد قرار دیتے ہیں اور شہوت اور غصہ کو دو بیویاں۔ جس طرح مرد کے عورت کے ساتھ ملنے سے بچہ پیدا ہوتا ہے اسی طرح کہتے ہیں عقل کے قوتِ غضبیہ یا قوتِ شہوت کے ساتھ ملنے سے اخلاق پیدا ہوتے ہیں۔

بعض کے نزدیک انسان میں خوشی حاصل کرنے کی زبردست خواہش ہے۔ یہ جب عقل سے ملتی ہے تو اخلاق پیدا ہوتے ہیں۔

میرے نزدیک اخلاق کے منبع کو مسلمانوں نے قرآن کریم کی روشنی میں بھی اچھی طرح نہیں سمجھا۔ میں نے قرآن کریم پر غور کر کے یہ سمجھا ہے کہ اخلاق کا منبع بہت گہرا ہے اور دور تک

چلا جاتا ہے۔ اگر صرف انسان میں افعال پائے جاتے جن کو اخلاق کہا جاتا ہے تو جو تعریف پہلوں نے کی ہے وہ صحیح ہوتی۔ مگر اس قسم کے افعال نچلی چیزوں میں بھی نظر آتے ہیں۔ مثلاً وہ کہتے ہیں عقل، شہوت اور غصہ سے مل کر اخلاق بنتے ہیں۔ اور محبت بھی ایک خلق ہے جو حیوانوں میں بھی پائی جاتی ہے۔ وہ کہتے ہیں عقل اور شہوت یا عقل اور غصہ کے ملنے سے تمام اخلاق بنتے ہیں۔ مگر حیوانوں میں عقل نہیں ہوتی۔ لیکن باوجود اس کے محبت جسے اخلاق میں شمار کیا جاتا ہے پائی جاتی ہے۔ اس لئے معلوم ہوا عقل، شہوت اور غصہ اخلاق کا منبع نہیں۔ ورنہ حیوانوں میں کوئی خلق نہ پایا جاتا۔

مَیں نے اِس مضمون پر غور کیا ہے اور خُدا تعالیٰ کے فضل سے ایسا جدید مضمون میری سمجھ میں آیا ہے کہ جس نے اخلاق کے مسئلہ کی کایا پلٹ دی ہے۔ دراصل اخلاق کی جڑھ چند قوتیں ہیں جو نہ صرف انسانوں میں بلکہ حیوانات میں بلکہ نباتات میں بلکہ جمادات میں بھی پائی جاتی ہیں۔ اور نہ صرف جمادات میں ہی پائی جاتی ہیں بلکہ ان ذرّات میں بھی پائی جاتی ہیں جن سے جمادات بنتے ہیں۔ چنانچہ دیکھ لو انسان سے اُتر کر حیوان میں بھی انسان کے مشابہ اعمال پائے جاتے ہیں۔ انسان میں غصہ ہے، حیوان میں بھی غصہ ہوتا ہے۔ انسان محبت کرتا ہے، حیوان بھی محبت کرتا ہے۔ اب ہم اس سے اور نیچے چلتے ہیں یعنی نباتات کو لیتے ہیں۔ ان میں بھی ہمیں ایسے افعال ملتے ہیں جو حیوانات اور انسانوں میں پائے جاتے ہیں۔ ہاں یہ فرق بے شک ہے کہ نباتات میں وہ افعال بہت ادنیٰ درجہ کے نظر آتے ہیں۔ مثلاً جس طرح انسان میں لینے اور دینے کی خواہش ہے اسی طرح نباتات میں بھی ہوتی ہے۔ اور اب نئی تحقیقات سے یہ ثابت ہو گیا ہے کہ قریباً تمام نباتات میں نر و مادہ ہیں (گو قرآن کریم میں یہ مضمون پہلے سے بیان ہو چکا ہے) اور جب نر مادہ سے ملے تب پھل بنتا ہے۔ کھجور کے متعلق یہ بات ہزاروں سال سے معلوم ہو چکی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ نباتات میں شہوت موجود ہے۔ پھر ان میں غصہ بھی پایا جاتا ہے۔ ڈاکٹر بوسؔ نے آلات کے ذریعہ یہ ثابت کر دیا ہے۔ موٹی مثال چھوئی موئی کی بوٹی دیکھ لو انگلی لگاؤ تو سُکڑ جائیگی۔ اگر اسکے پھل کو ہاتھ لگایا جائے تو اپنے اندر کا بیج باہر پھینک کر سُکڑ جاتا ہے۔ امریکہ میں

ایک درخت ہے، اگر گوشت والی چیز اس کے قریب جائے تو خوش ہو کر پھیل جاتا ہے۔ اور اگر وہ چیز اس کے ساتھ لگ جائے تو سُکڑ جاتا ہے اور اس کا خون چوس کر اُسے پھینک دیتا ہے۔ اِس قسم کی مثالوں سے ثابت ہے کہ نباتات میں بھی یہ احساس پائے جاتے ہیں۔

اب ہم اور نیچے چلتے ہیں اور جمادات کو لیتے ہیں۔ کہتے ہیں انسان میں محبت ایک بہت اعلیٰ خُلق ہے۔ مگر محبت کیا ہے۔ محبت اپنی طرف کھینچنے کو کہتے ہیں۔ پھر کیا مقناطیس لوہے کو اپنی طرف نہیں کھینچتا۔ اس میں بھی یہ جذبہ ہے مگر بہت سادہ جذبہ ہے۔ اس کے مقابلہ میں بجلی کی ایک ہی قسم کی طاقت اگر وہ چیزوں میں پیدا کر دی جائے تو وہ دونوں چیزیں ایک دوسرے سے پیچھے ہٹتی ہیں۔ گویا ایک دوسرے سے نفرت کا اظہار کرتی ہیں۔ پس ثابت ہو گیا کہ محبت اور کشش نفرت اور غصّہ کا مادہ جمادات میں بھی پایا جاتا ہے۔

پھر مَیں نے بتایا ہے کہ یہ طاقتیں باریک ذرّات میں بھی موجود ہیں۔ اگر ان میں یہ طاقتیں نہ ہوتیں تو پھر دُنیا بن ہی نہ سکتی تھی۔ اگر ذرّات ایک دوسرے کو کھینچ کر آپس میں اکٹھے نہ ہوں تو کسی چیز کا دُنیا میں قائم ہونا ناممکن ہو جائے۔ یہ جذب کرنے کی طاقت ہی ہے جس نے ذرّات کو آپس میں ملایا ہوا ہے۔ پس ثابت ہو گیا کہ اخلاق کا مادہ بہت گہرا ہے۔ گو یہ درست ہے کہ جتنے جتنے ہم نیچے جائیں بعض اخلاق کا ہی پتہ لگتا ہے اور بعض کا نہیں لگتا۔ مگر اس میں بھی شک نہیں کہ جڑھ ہر جگہ موجود ہے۔

اِس امر کو مثالوں سے ثابت کر دینے کے بعد کہ اخلاق کا ظہور جن خاصیتوں سے ہوتا ہے وہ ذرّاتِ عالم میں بھی پائی جاتی ہیں۔ اب مَیں یہ بتاتا ہوں کہ وہ کونسی خاصیتیں ہیں جو اخلاق کا مادہ ہیں۔ یاد رکھنا چاہئے کہ مادہ کی ابتدائی حالت پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح مادہ میں شش جہات ہیں یعنی اُوپر نیچے۔ دائیں بائیں۔ آگے پیچھے۔ اسی طرح چھ باطنی جہات بھی ہیں اور وہ بھی اپنی نسبت کے لحاظ سے اِسی طرح جوڑا جوڑا ہیں جس طرح ظاہری جہات جوڑا جوڑا ہیں۔ یعنی جس طرح ظاہری جہات ایک نسبت کے لحاظ سے مثلاً دائیں ہوتی ہے تو دوسری نسبت سے بائیں۔ ایک نسبت سے آگے ہوتی ہے اور ایک نسبت سے پیچھے۔ ایک نسبت سے اوپر ہوتی

ہے تو دوسری نسبت سے نیچے۔ اسی طرح باطنی چھ جہات بھی نسبتوں کے لحاظ سے وہ دو قسم ہوتی ہیں یعنی ذکوری وانا ثی۔ دوسروں پر اپنی تاثیر ڈالنے والی اور دوسروں سے اثر قبول کرنے والی۔ یہ ظاہر بات ہے کہ اس چیز پر کوئی اثر نہیں پڑ سکتا جو اثر نہ قبول کر سکے۔ مثلاً آٹا نرم ہوتا ہے۔ اس میں مٹھی گھس جاتی ہے مگر میز میں نہیں گھس سکتی۔ کیونکہ یہ اس کے اثر کو قبول نہیں کرتی۔ اس سے معلوم ہوا تبھی کوئی کام ہوسکتا ہے جبکہ ایک طرف کام کرنے کی طاقت اور دوسری طرف اثر قبول کرنے کی قابلیت ہو۔ ہر ذرّہ جو پایا جاتا ہے اس میں کھینچنے اور کھینچے جانے کی طاقت ہے۔

پہلی باطنی جہت جذب یعنے کھینچنے کی طاقت ہے۔ اور اسکے ساتھ کی میل یعنی جھکنا جب موافق سامان پیدا ہو جائیں گے۔ وہ کھینچنے لگ جائیگا یا دوسری طرف کھینچ جائیگا۔ اسی طرح دوسری جہت دفع کی ہے اور اس کے ساتھ کی دوسری طاقت اعراض کی۔

تیسری خصوصیت ہر ذرّہ میں افناء کی ہے۔ ہر چیز جو اپنا وجود قائم کرتی ہے دوسری اشیاء کو فنا کرتی ہے۔ مثلاً مَیں اپنا ہاتھ یہاں سے اُٹھا کر وہاں رکھوں تو پہلے ہاتھ رکھنے کی جو شکل بنی تھی وہ فنا کر کے دوسرے بنائی گئی۔ اسی طرح ذرّات جب اثر قبول کر کے نئی شکل اختیار کرتے ہیں تو پہلی پر فنا وارد ہو جاتی ہے۔ اسکے مقابل کی خصوصیت فنا کی ہوتی ہے۔ یعنی ہر ذرّہ میں جہاں دوسرے کو فنا کرنے کی قابلیت ہے وہاں اس میں خود فنا ہونے کی بھی قابلیت ہے۔

چوتھی خصوصیت ابقار کی ہے۔ کوئی چیز گراؤ آگے دیوار ہو تو وہ اُسے ٹھیرا لیگی۔ یہ باقی رکھنے کی طاقت ہے۔ اس کے مقابل کی خصوصیت بقاء ہے یعنی باقی رہنے کی قابلیت۔ پانچویں خصوصیت اظہار کی ہے۔ یعنی بعض چیزوں کو اُبھارنا، ظاہر کرنا، ہر ذرّہ دوسرے کو اُبھارتا ہے۔ اسے موٹا اور نمایاں کر دیتا ہے۔ اسکے مقابل کی خصوصیت ظہور ہے۔ یعنی ہر ذرّہ میں نمایاں ہونے اور ظاہر ہونے کی خصوصیت بھی ہے۔

چھٹی خصوصیت اخفار ہے یعنی کسی چیز کو مخفی کر دینا۔ مثلاً میرے ہاتھ کے پیچھے کوئی چیز ہو تو وہ اسے چھپا دیگا۔ اسکے مقابلہ میں خفاء یا چھپنے کی طاقت ہے۔ یعنی اپنے وجود کو مخفی کر دینا اور دوسرے کے سایہ میں آجانا۔

یہ طاقتیں جو مادہ کے باریک سے باریک حصّہ میں پائی جاتی ہیں اخلاق کی بنیاد ہیں۔تمام اخلاق کی بنیاد انہی پر ہے۔اور یہی ترقی کرتے کرتے انسان میں ایک حیرت انگیز صورت میں ظاہر ہو جاتی ہیں۔ جوں جوں مادہ مرکب ہوتا جاتا ہے اجزاء ملتے جاتے ہیں۔ اسکے افعال میں زیادتی اور صفائی پیدا ہوتی جاتی ہے۔ جوں جوں مادہ ترقی کرتا ہے یہ خاصیتیں اعلیٰ پیرایہ میں اور مختلف اقسام سے ظاہر ہوتی ہیں۔ اور جس قدر ادنیٰ ہوتا جاتا ہے ان خصوصیات کا ظہور ادنیٰ اور محدود ہوتا جاتا ہے جبتک خالص مادی قوانین کے ماتحت یہ خاصیتیں عمل کرتی ہیں اُسوقت تک ہم ان کے ظہوروں کو اچھا اور بُرا تو کہہ سکتے ہیں مگر اخلاقِ فاضلہ یا سیئہ نہیں کہہ سکتے۔ جس طرح ہر چیز جو کام نہ دے ہم اُسے بُرا اور جو کام دے اسے اچھا کہنے لگ جاتے ہیں اور اسکے یہی معنے ہوتے ہیں کہ ان چھ خاصیتوں کا ظہور ان سے قانونِ قدرت کے مطابق پوری طرح ہو رہا ہے یا نہیں ہو رہا۔ دیکھو یہ سوٹی اگر کسی پر جا گرے تو اسے بُرا محسوس ہوگا مگر یہ نہیں کہیگا کہ یہ سوٹی کی بد خلقی ہے۔ اسی طرح اگر کسی کو کہیں پڑا ہوا ایک پیسہ مل جائے تو وہ کہیگا اچھی بات ہے مگر یہ نہ کہیگا کہ پیسہ کی بڑی مہربانی ہے۔ پس جب تک افعال مادی ظہور کے مطابق ہوں ہم انہیں اچھا یا بُرا تو کہہ سکتے ہیں مگر اخلاق نہیں قرار دے سکتے۔ اچھا یا بُرا کہنے سے مراد صرف یہ ہوتی ہے کہ ہماری منشاء کے مطابق وہ کام کر رہے ہیں یا ہمارے منشاء کے خلاف۔

بعض دفعہ اچھائی یا بُرائی نسبتی ہوتی ہے۔ مثلاً ایک شخص کو گولی لگی تو جو اُس شخص کے ہمدرد ہونگے وہ کہیں گے بُرا ہوا لیکن جو مخالف ہوں گے وہ کہیں گے اچھا ہوا۔ یہ بُرائی اور اچھائی نسبتی ہے۔ ہم اسے خُلق نہیں کہہ سکتے۔ یہ ایک طبعی قوت کا اظہار ہے جو طبعی قوانین کے ماتحت ظاہر ہو رہی ہے۔ ارادہ کا چونکہ دخل نہیں اس لئے اسے خُلق بھی نہیں کہتے۔ مگر فعل ایک ہی قسم کا ہے۔

ہاں مگر جب ترقی کرتے کرتے مادہ انسانی شکل اختیار کرتا ہے تو یہ چھ خاصیتیں سینکڑوں شکل میں ظاہر ہونے لگتی ہیں چونکہ انسان مادہ سے مرکب در مرکب ہو کر بنا ہے اور اس وجہ سے یہ خاصیتیں بھی اسکے اندر مرکب در مرکب ہوتی چلی گئی ہیں۔ انکی مثال رنگوں کی ہے کہ جو اصل میں تو صرف چھ سات ہیں مگر ان کو مرکب کر کے سینکڑوں رنگ پیدا کر لئے گئے ہیں۔ چونکہ انسان میں

ان خاصیتوں کا ظہور نئے رنگ میں ہونے لگتا ہے اسے خلق کہتے ہیں۔ گویا وہ ایک نئی پیدائش ہے۔ اور خَلق یعنی جسمانی پیدائش سے ممتاز کرنے کے لئے اسے خُلق پیش سے کہنے لگے ہیں ورنہ اصل میں وہی چھ خاصیتیں ہیں جو ابتدائی سے ابتدائی مادہ میں بھی پائی جاتی ہیں۔ جب تک وہ جمادات میں کام کرتی ہیں ان کو طاقتیں کہتے ہیں۔ جب نباتات میں ایک زیادہ مکمل ظہور ان کا ہوتا ہے انہیں حسیں کہتے ہیں۔ جب حیوانات میں اس سے بھی زیادہ مکمل ظہور ہوتا ہے تو انہیں شہوات یا طبعی تقاضے کہتے ہیں۔ اور جب اس سے بھی زیادہ مکمل صورت میں انسان میں ان کا ظہور ہوتا ہے تو فکر اور ارادے کے بغیر انکے ظہور کو طبعی تقاضے یا اظہارِ فطرت کہتے ہیں۔ اور جب ارادے یا فکر کے ماتحت اُن کا ظہور ہوتا ہے تو اسے خُلق کہتے ہیں۔ یعنی ترقی کے اعلیٰ درجہ پر پہنچ گئیں۔ جیسے قرآن کریم میں بھی انسان کی تخلیق کے متعلق آتا ہے **ولقد خلقنا الانسان من سلٰلة من طينٍ. ثم جعلنٰه نُطْفَةً فى قرارٍ مكينٍ. ثمّ خلقنا النطفة علقة فخلقنا العلقة مضغة فخلقنا المضغة عظٰمًا. فكسونا العِظٰم لحماً. ثمّ انشأنٰه خلقًا اٰخر فتبارك اللّٰه احسن الخالقين.** (۲۳-۱۳تا۱۵) انسان کو خدا نے سب سے اعلیٰ مخلوق بنادیا اور سب خُلق اس کے ماتحت آ گئی۔

اب اس اصل کو سمجھ لینے کے بعد انسانی اخلاق پر غور کرو۔ سب اخلاق کا باعث یہی سیدھے سادھے خواص جو مادے میں پائے جاتے ہیں نظر آتے ہیں۔ جو مختلف مدارجِ ارتقاء کے بعد اس حالت کو پہنچ گئے ہیں۔ اور اس وجہ سے ان کو اپنی ذات میں ہم ہرگز بُرا نہیں کہہ سکتے۔ کیونکہ وہ طبعی تقاضے ہیں۔ ہم انہیں تبھی بُرا کہہ سکتے ہیں۔ جب وہ بے محل استعمال ہوں۔ مثلاً بزدلی ہے، سب لوگ اسے بُرا کہتے ہیں۔ لیکن کیا اس کا یہی مطلب نہیں ہے کہ ایک بات سے انسان پیچھے ہٹتا ہے۔ اور خالی پیچھے ہٹنا بُرا نہیں کہلا سکتا ہے۔ وہ اعراض کے قدرتی جذبہ کا اظہار ہے۔ ہم اسے تبھی بُرا کہیں گے جب کہ وہ فعل عقل اور مقتضائے وقت کے خلاف کیا گیا ہو۔ چنانچہ ہم زہد کو دیکھتے ہیں تو وہ بھی پیچھے ہٹنے کا ہی فعل ہے لیکن سب لوگ اسے اچھا کہتے ہیں۔ حالانکہ دونوں فعلوں کی شکل ایک ہے۔ لیکن حق یہ ہے کہ یہ فعل بھی اپنی ذات میں نہ اچھا ہے نہ بُرا۔ بلکہ جب عقل اور

مقتضائے وقت کے مطابق یہ فعل ہوتو اچھا ہے ورنہ بُرا خواہ اس کا نام زہد رکھو یا کچھ اور۔ اسی طرح صبر ہے، اس میں بھی خاصیتِ اعراض کا ہی ظہور ہے۔ اور ہم اسے اچھا تبھی کہیں گے جب یہ عقل و مقتضائے وقت کے مطابق ہو ورنہ نہیں۔

اب مَیں ایک مثال خاصیتِ میل کی بیان کرتا ہوں اور وہ عاشقانہ محبت کی یعنی اُس محبت کی جو محبّ اپنے محبوب سے کرتا ہے مثال ہے۔ ایک مرید اپنے پیر سے یا شاگرد اپنے اُستاد سے اس قسم کی محبت کرتا ہے۔ وہ اسکے حسن کو دیکھ کر جو اپنے اندر جذب رکھتا ہے اسکی طرف جھک جاتا ہے۔ جب یہ محبت عقل و مقتضائے وقت کے ماتحت ہوتی ہے خُلق حسن کہلاتی ہے۔ اور جب ایسی نہ ہو تو آوارگی اور کمینگی۔ لیکن دونوں حالتوں کے اندر حقیقت ایک ہی پوشیدہ ہے۔ اور وہی خاصیت دوسرے کی کشش کو قبول کر لینے کی جو مادہ میں بھی موجود تھی ایک دوسری شکل میں ظاہر ہوئی ہے۔

قوتِ دفع سے پیدا ہونے والے اخلاق کی مثال میں بہادری کو پیش کیا جا سکتا ہے۔ بہادری کیا ہے۔ وہی خاصیت دفع کی جو مادہ میں موجود تھی اس شکل میں ظاہر ہوتی ہے۔ اور جب موقع مناسب پر استعمال کی جائے تو خُلق حسن کہلاتی ہے۔ ورنہ بد خُلقی۔ گالیاں دینے کی عادت بھی اسی خاصیت کی ایک شاخ ہے۔ اس کی غرض بھی دوسرے کے الزام یا حملہ یا ظلم کو اپنے سے دور کرنا ہوتی ہے۔

قوتِ جذب کا ایک ظہور ہے۔ قوتِ جذب دوسری اشیاء کو اپنی طرف کھینچتی ہے۔ یہی مادہ جس وقت حرص انسانی افعال میں ظاہر ہوتا ہے تو کبھی حرص کی شکل میں اموال اور رُتبوں کو کھینچنے میں لگ جاتا ہے اور جب ناجائز طور پر ظاہر ہوتا ہے تو اسے بُرا اور نہ اچھا کہتے ہیں۔ اسی خاصیت کے ماتحت بشاشت یعنی خوش خلقی سے ملنا بھی ہے اور مدح اور محبت، محبوبی اور درع اور اشاعتِ حق کے لئے جھگڑنے کی صفات بھی اسی جذبہ کے ماتحت ہیں۔

فناء کی خاصیت سے پیدا ہونے والے اخلاق کی مثال میں تہور کو پیش کیا جا سکتا ہے۔ تہوّر اس جذبہ کو کہتے ہیں کہ انسان اپنی فنا کا فیصلہ کر لیتا ہے اور کہہ دیتا ہے۔ کہ مَیں اپنی جان کی بالکل

پرواہ نہیں کرونگا۔ یہ جذبہ بھی کبھی عقل کے ماتحت ہوتا ہے۔ اسوقت یہ جذبہ نہایت اعلیٰ ہوتا ہے جیسے نعمت اللہ خان نے کیا کہ جان دینے کا قطعی فیصلہ کرلیا مگر ایمان کی حفاظت کی۔ جب عقل کے ساتھ صحیح طور پر اس کا استعمال کیا جاتا ہے تو کہتے ہیں یہ قربانی ہے لیکن جب عقل کے ماتحت نہ ہو جیسے آگ جل رہی ہو اور کوئی اس میں گر کر اپنے آپ کو جلا دے تو یہ بھی تہور ہی ہے۔ لیکن عقل کے ماتحت نہیں اسلئے بُرا ہے۔

دوسری مثال اس جذبہ کی احسان ہے۔ یعنی ایک شخص دوسرے کی خاطر اپنا حق چھوڑ دیتا ہے اور ایک حد تک اپنے لئے فنا کے سامان پیدا کرتا ہے۔ چونکہ وہ ان اشیاء کو جو اُسکے بقاء کے لئے تھیں دوسروں کو دے دیتا ہے۔

افناء کی خاصیت سے پیدا ہونیوالے اخلاق کی مثال میں قتل، غارت، کینہ کو پیش کیا جا سکتا ہے کہ ان اخلاق کی تہ میں افنا کی خواہش کا زور معلوم ہوتا ہے۔

ابقاء کی خاصیت کے ماتحت پیدا ہونے والے اخلاق کی مثال میں سخاوت، امید، احسان اور اسی قسم کے اور اخلاق کو پیش کیا جا سکتا ہے (احسان کو پہلے فناء کے نیچے بیان کیا گیا ہے۔ اسکی یہ وجہ ہے کہ بعض اخلاق مرکب ہوتے ہیں ارو وہ خاصیتوں سے مل کر پیدا ہوتے ہیں یا مختلف وقتوں میں مختلف جذبات کا ظہور ہوتے ہیں)

کبر دوسروں سے آگے بڑھنے کی خواہش، شجاعت، خود پسندی، ظہور کی خاصیت سے پیدا ہونے والے اخلاق میں شمار ہو سکتے ہیں۔ کیونکہ انکی تہ میں ظاہر ہونے کی خواہش مخفی ہے۔

افشاءسر، ریاء، بے حیائی، صدق ایسے اخلاق میں جو اظہار کی خاصیت کے غیر مادی ظہور ہیں۔

توکل، غفلت اور حیاء کے اخلاق قوتِ خفاء یعنی پوشیدہ ہو جانے کے مادہ سے ترقی کر کے پیدا ہوتے ہیں۔

استہزاء، مزاح، جھوٹی گواہی، رازداری، جھوٹ، اخفاء کی خاصیت کا غیر مادی ظہور معلوم ہوتے ہیں۔

بعض اخلاق مرکب ہوتے ہیں جیسا کہ حسد، جذب اور افناء سے مرکب ہے اور حقد

اعراض اور افناء سے مرکب ہے۔

بعض اخلاق مختلف حالتوں میں مختلف خاصیتوں کے ماتحت پیدا ہوتے ہیں جیسا کہ مراء اور جدال یعنی ہمت کرنا اور جھگڑنا کبھی اعراض کے ماتحت ہوتا ہے۔ اسوقت اس کی غرض دوسرے کا دعویٰ باطل کرنا ہوتا ہے۔ کبھی ہمت اور جھگڑا حق لینے کے لئے ہوتا ہے۔ اس وقت یہ جذب کی خاصیت کے ماتحت ہوتا ہے۔

غرض انسانی اخلاق کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ درحقیقت مادہ کے خواص کی ایک ترقی یافتہ صورت میں اور صرف ارتقاء کی حالت میں غیر مادی صورت اختیار کر گئے ہیں اور بعض صورتوں میں مرکب ہو گئے ہیں۔ اس اصل کے ماتحت جو مَیں نے اوپر بیان کیا ہے نہ صرف یہ کہ اخلاق کی جڑ اور حقیقت ہی معلوم ہو جاتی ہے بلکہ اس سے بڑھ کر یہ فائدہ بھی ہوتا ہے کہ صاف ظاہر ہو جاتا ہے کہ اخلاق کی بُرائی اور بھلائی ذاتی نہیں ہے بلکہ ان کے استعمال کی طرز اور موقعہ سے وابستہ ہے۔ کیونکہ خاصیات اپنی ذات میں نہ بُری ہیں نہ اچھی۔ مگر اس سے بھی بڑھ کر اس تحقیق سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ دُنیا کو پیدا کرنے والی ایک ہستی ہے۔ کیونکہ اخلاق کی ایسی گہری جڑ آپ ہی آپ پیدا ہو سکتی تھی۔ صاف ظاہر ہے کہ ابتدائے عالم سے اس امر کا خیال رکھنا کہ انسان کے دل میں اخلاق کی ایک گہری جڑ قائم کی جائے جس سے وہ آزاد ہو ہی نہ سکے۔ بغیر کسی بالا رادہ ہستی کے فعل کے نہیں ہوسکتا۔ اسی نے انسان کی پیدائش کی غرض کو مدنظر رکھ کر اس کے خمیر میں ہی اخلاق کی آمیزش کی۔ تا وہ ہر حالت اور ہر عمر میں اخلاق کے اثر کو قبول کرنے کی قابلیت رکھے اور ان کی طرف اسے فطرتی میلان ہو۔

اعلیٰ اخلاق کا خیال کیوں رکھا جائے؟

اخلاق کی حقیقت کے بیان کرنے کے بعد مَیں اِس سوال کا جواب دینا چاہتا ہوں کہ اعلیٰ اخلاق کیوں برتے جائیں اور بُرے اخلاق سے کیوں اجتناب کیا جائے؟

یورپ کے لوگ چونکہ فلسفۂ اشیاء کی طرف زیادہ متوجہ ہیں انہوں نے اِس سوال کو خاص

اہمیت دی ہے اوران میں سے محققین نے بڑے غور کے بعد اس سوال کا یہ جواب دیا ہے کہ اعلیٰ اخلاق اپنی ذات میں اچھی چیز ہیں۔ اس لئے خود اعلیٰ اخلاق کی خاطر نہ کہ کسی اور غرض سے انکو قبول کرنا چاہیئے۔

اسلامی ماہرین اخلاق نے اِس سوال کا یہ جواب دیا ہے کہ انسان کو اخلاق کا اظہار بہ نیتِ ثواب کرنا چاہیئے۔ اورامام غزالی یہاں تک کہتے ہیں کہ اگر کوئی صحت کے خراب ہونے کے خیال سے زنا سے بچے تو وہ متقی نہیں ہے۔

اِس خیال پر مغربی خیال کے دلدادہ دو اعتراض کرتے ہیں۔ (۱) جو شخص کسی مریض کا علاج اسکی صحت کے خیال سے نہیں بلکہ ثواب کی خاطر سے کرتا ہے کیا وہ تاجر نہیں۔ پھر جو شخص تجارت کے طور پر ان کاموں کو کرتا ہے وہ کیوں اچھا سمجھا جائے۔ (۲) اگر کوئی شخص زنا سے اپنی حفاظتِ عزّت یا صحت کے لئے بچے تو وہ کیوں عفیف نہیں ہے۔ اور اگر عفیف نہیں ہے تو شریعت نے زنا سے منع کیوں کیا ہے۔ تم کہتے ہو چونکہ اس طرح زنا سے بچنے میں ثواب کی نیت نہیں اس لئے وہ اخلاق نہیں کہلا سکتے۔ ہم پوچھتے ہیں خدا کسی کام کا ثواب کیوں دیتا ہے، اسی لئے نہ کہ جس کام کے متعلق وہ کہتا ہے یوں نہ کرو وہ نہ کیا جائے۔ اور جس کام کے متعلق وہ کہے کرو وہ کیا جائے۔ اب سوال یہ ہے کہ وہ کیوں کسی کام کے متعلق کہتا ہے کہ یہ کرو اور کیوں کہتا ہے کہ فلاں کام نہ کرو۔ اگر بغیر کسی حکمت کے تو اسکی شریعت بے معنی اور فضول ہوئی اور اگر کسی سبب سے اور حکمت کے ماتحت تو اس حکمت کو مدنظر رکھ کر کام کرنا کیوں اخلاق فاضلہ میں شامل نہ ہوگا۔ جس حکمت کو خدا تعالیٰ حکم دیتے وقت مدنظر رکھتا ہے اگر بندہ اسے کام کرتے وقت مدنظر رکھے تو اس کے کام کی قدر کیوں کم ہو جائے۔ مثلاً خدا تعالیٰ نے اگر زنا صحت یا قیامِ امن کے لئے منع فرمایا ہے تو جب ہم اسی غرض کو مدنظر رکھتے ہوئے زنا نہ کریں تو یہ کیوں اچھا خُلق نہ سمجھا جائے اور ہم کیوں ثواب کے مستحق نہ ہوں۔ اور اگر زنا سے منع کرنے کا کوئی فائدہ نہیں تو معلوم ہوا خدا تعالیٰ نے اس کی ممانعت کا یونہی حکم دیا ہے۔

پہلے اعتراض یعنی تجارت کا جواب یہ ہے کہ اس فعل اور تجارت میں کوئی مناسبت نہیں۔ کیونکہ

اخلاق حسنہ کی جزا خدا تعالیٰ نے پہلے مقرر کر رکھی ہے اور کہہ چھوڑا ہے کہ جو فلاں افعال سے بچیگا
اُسے یہ بدلہ دیا جائیگا۔ اور جو فلاں افعال کریگا اُسے یہ بدلہ دیا جائیگا۔ پس یہ تجارت نہیں بلکہ انعام
ہے کیونکہ تجارت میں انسان اپنے کام کی قیمت خود مقرر کرتا ہے۔ یہاں بدلہ اسکی پیدائش سے بھی
پہلے کا مقرر شدہ ہے اور طبعی بدلہ ہے۔ خواہ ہم خدا تعالیٰ کو راضی کرنیکی نیت رکھیں یا نہ رکھیں وہ بدلہ
ہمیں مل رہا ہے اور ملیگا۔ پس یہ تجارت نہیں۔ تجارت تو یہ ہے کہ مثلاً ایک کے پاس گھی ہے اور
دوسرے کے پاس روپیہ وہ روپیہ دیکر گھی خرید لیتا ہے لیکن بیچنے والا مختار ہے خواہ اپنی چیز دے یا نہ
دے۔ مگر یہاں معاملہ برعکس ہے۔ کیونکہ کام لینے والے نے خود ہی انعام کا وعدہ کیا ہے اور کام
کرنیوالے نے اس سے کوئی مطالبہ نہیں کیا۔ پھر یہ فرق ہے کہ وعدہ کرنیوالا وہ ہے جس کے ہم
بہرحال محتاج ہیں۔ اگر وہ افعال جنہیں ہم بہ نیتِ ثواب کرتے ہیں نہ بھی ہوں تب بھی اسی کے
احسان سے جیتے ہیں۔ اس ایسے شخص کے انعام کو جس کے انعام کے بغیر ہم زندہ ہی نہیں رہ سکتے
تجارت نہیں کہا جا سکتا۔ تجارت اسی سے ہوتی ہے جس سے ہم مستغنی ہوں خواہ تعلق رکھیں یا نہ رکھیں۔

دوسرا اعتراض بالکل ٹھیک ہے بشرطیکہ یہ کہا جائے کہ اگر بہ نیتِ ثواب کوئی کام نہ ہو تو وہ
اخلاق سے نہیں۔ اصل جواب ان اعتراضوں کا یہ ہے کہ تم لوگ ثواب کی حقیقت کو نہیں سمجھے۔
ثواب کے معنے اگر روپیہ پیسہ کے ہوں تو بیشک تمہارا اعتراض درست ہو سکتا ہے۔ مگر ثواب کے
معنے روپیہ اور پیسہ کے نہیں ہیں بلکہ اس اعلیٰ مقصد کے حاصل ہونے کے ہیں جس کے لئے انسان
پیدا کیا گیا ہے اور وہ مقصد یہ ہے کہ ہم کامل الصفات ہو جائیں۔ ہمارے اندر وہ طاقت پیدا ہو
جائے جس سے پاکیزگی ہمارا ذاتی جوہر ہو جائے اور ہم طہارت کا سرچشمہ ہو جائیں۔ جو
انعامات کہ بظاہر مادی معلوم ہوتے ہیں وہ یا تو استعارے ہیں اور یا پھر اصل مقصد نہیں بلکہ
لوازمات سے ہیں۔ اور لوازمات اصل مقصد نہیں ہوتے۔ ایک دوست کی انسان خاطر کرتا ہے،
وہ خاطر اصل نہیں۔ بلکہ لازمہ ہے۔ اصل دلی میلان اور اندرونی اتصال ہے۔ اسی طرح ثواب
سے مراد کھانا اور پینا نہیں بلکہ کمالِ ذاتی کا حصول ہے جیسا کہ قرآن کریم میں آتا ہے۔ وَمَا
خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْن. یعنی انسانی پیدائش کی غرض عبد بننا ہے۔ پس ثواب یہ

ہے کہ انسان کو عبد بننے کی توفیق عطا ہو اور وہ کامل ہو جائے۔ اور اس میں کیا شک ہے کہ اس غرض سے کام کرنے سے ہی اخلاق، اخلاق کہلا سکتے ہیں۔ ورنہ وہ صرف ظاہری مشقیں ہیں اَور کچھ نہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ جو شخص ظاہری اخلاق کے مطابق عمل کریگا وہ دُنیا میں ایک حد تک فائدہ اٹھائیگا۔ لیکن اگر اس کی غرض ساتھ ہی کامل ہونے کی نہیں اور خدا کی رضا کی اُسے جستجو نہیں تو کمال اُسے کس طرح حاصل ہوگا۔ باطنی اور ذہنی افعال کا دارومدار تو نیتوں پر بہت ہی مبنی ہے۔ ہم تو دیکھتے ہیں کہ جسمانی افعال بھی نیتوں سے وابستہ ہیں۔ ورزش کرتے وقت اگر جسم کی طاقت کا خیال رکھا جائے تو اعلیٰ نتیجہ پیدا ہوتا ہے اور اگر نہ رکھا جائے تو ادنیٰ۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ ہم رضائے الٰہی کے لئے اخلاق پر عمل کرتے ہیں اور رضائے الٰہی کے حصول سے یہ مراد نہیں کہ خدا تعالیٰ ہمیں کچھ آئندہ دے۔ بلکہ یہ ہے اس کے دئے ہوئے کا شکر ادا کریں۔ اور اخلاقی طور پر اس کے حضور سرخرو ٹھہریں۔

علاوہ ازیں مَیں کہتا ہوں معترض خود اپنی حقیقت کو نہیں سمجھا۔ اگر انعام کامل جانا خودغرضی ہے تو اس کے اندر بھی خودغرضی موجود ہے۔ ہم اس سے دریافت کرتے ہیں کہ بیمار کا علاج کوئی شخص کیوں کرتا ہے۔ اگر وہ کہے کہ دلی رحم کی وجہ سے تو پھر یہ خوبی نہ رہی۔ کیونکہ اگر اسے دل مجبور کرتا ہے کہ ضرور علاج کرو تو پھر علاج کرنے والے کی یہ خوبی نہیں وہ تو اپنے دل سے مجبور ہو کر کر رہا ہے۔ اگر یہ نہیں تو کوئی اور وجہ ہوگی۔ اور وہ تعاون کا خیال ہے۔ انسان سمجھتا ہے آج مَیں کسی کا علاج کرونگا تو کل میرا بھی کوئی کریگا۔ اس میں بھی اس کام کا بدلہ ملنے کا خیال ہو گیا۔ اس کے مقابل پر ہماری طرف دیکھو کہ ہم یہ نیت نہیں رکھتے کہ جو ہم کام کرتے ہیں انکا بدلہ روپیہ پیسہ کی شکل میں ہمیں آئندہ ملے۔ بلکہ یہ نیت کرتے ہیں کہ ہم اس پہلے انعام کا شکریہ ادا کرتے ہیں جو ہمیں اس وقت تک خدا تعالیٰ کی طرف سے مِل چکا ہے۔

بااخلاق کسے کہتے ہیں؟

اَب مَیں یہ بتاتا ہوں کہ بااخلاق کسے کہتے ہیں۔ مسیحیوں کے نزدیک جسمیں سب خوبیاں

ہوں اور جو سب عیبوں سے پاک ہو وہ بااخلاق ہوتا ہے۔ باقی مذاہب والے بھی تھوڑے بہت اسی طرف گئے ہیں۔ مگر اسلام کہتا ہے: **فاما من ثقلت موازینه . فھو فی عیشةٍ راضیةٍ . واما من خفّت موازینه. فامّه ھاویه.** (۱۰۱-۷تا۱۰) کہ جس کی نیکیاں زیادہ ہوں وہ اچھے اخلاق والا ہے اور جس کی بدیاں زیادہ ہوں وہ بداخلاق ہے۔ دیگر مذاہب والے کہتے ہیں اگر ایک شخص ساری عمر نیکیاں کرتا رہے اور ایک بدی کا مرتکب ہو جائے تو بداخلاق ہوگا۔ لیکن اسلام کہتا ہے جو شخص کوشش کر کے کثرت کے ساتھ خوبیاں پیدا کر لیتا ہے اس میں اگر بعض عیوب بھی ہوں جن کو خوبیاں چھپا لیں تو وہ بااخلاق ہے۔

اصل بات یہ ہے کہ دیگر مذاہب والے سمجھتے ہیں شریعت تحکم ہے۔ اس کے احکام کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ اسلئے ذرا کوئی حکم توڑا اور انسان پکڑا گیا۔ گویا شریعت تعزیرات کے طور پر ہے۔ مگر اسلام کہتا ہے اخلاق اور شریعت کے احکام اپنی ذات میں مقصود نہیں بلکہ یہ تو ورزشیں ہیں جو انسان میں دلی پاکیزگی پیدا کرنے کے لئے ہیں۔ ان کے ذریعہ مشق کرائی جاتی ہے تاکہ پاکیزگی پیدا ہو۔ اسلئے اگر کسی مشق میں کوئی غلطی ہو جائے تو یہ نہیں کہ ضرور اسکی سزا دی جائے تا وقتیکہ اس غلطی سے مشق کی اصل غرض کو نقصان نہ پہنچتا ہو اور اصل مقصد فوت نہ ہو جاتا ہو۔ جیسے مثلاً سکول میں اگر کوئی لڑکا دس سوالوں میں سے ایک درست نہ نکالے تو اسے سزا نہیں دی جائیگی۔ اسی طرح ڈاکٹر غلطیاں بھی کرتے ہیں۔ لیکن انکے علاج سے لوگوں کو صحت ہو تو وہ ڈاکٹر سمجھے جاتے ہیں۔ پس اگر کسی میں بعض نقص رہ بھی جائیں تو بھی وہ بااخلاق سمجھا جا سکتا ہے۔ لیکن اسکا یہ مطلب نہیں کہ کوئی کہے اچھا میں اور کوئی برائی نہیں کرونگا صرف چوری کر لیا کرونگا۔ اس ایک نقص کا تو کوئی حرج نہیں۔ یہ بغاوت ہے اور بغاوت معاف نہیں ہوا کرتی۔ معاف غلطی ہوتی ہے۔ مثلاً ایک طالب علم کہے کہ میں ایک سوال کا جواب نہیں دوں گا تو اسے سکول سے نکالا جائیگا کیونکہ اس نے ممتحن کی ہتک کی۔ لیکن اگر وہ ایک آدھ سوال حل نہ کر سکے تو اس وجہ سے اسے کوئی سزا نہ دی جائیگی۔

کیا اخلاق کی اصلاح ممکن ہے

اَب یہ سوال ہے کہ کیا اخلاق کی اصلاح بھی ممکن ہے۔ گو عام طور پر لوگ کہتے ہیں کہ ممکن ہے۔ مگر اپنے معاملہ میں آ کر کہہ دیا کرتے ہیں کہ کچھ نہیں بنتا۔ اسی مجمع میں جس سے پوچھو کہ اخلاق درست ہو سکتے ہیں تو کہیگا۔ ہاں ضروری ہو سکتے ہیں۔ اور اگر کہو تم نے اپنے اخلاق کی اصلاح کر لی ہے تو کہیگا۔ مَیں نے بہت زور لگایا ہے مگر کچھ نہیں بنتا۔ عام طور پر تو یہ ہوتا ہے کہ لوگ دوسروں کے لئے بُری رائے ظاہر کرتے ہیں۔ اور اپنے لئے اچھی۔ مگر اس معاملہ میں اُلٹ ہوتا ہے۔ کیونکہ وہ دوسرے لوگوں کے لئے اچھی رائے ظاہر کرتے ہیں اور اپنے لئے بُری۔ مگر قرآن کریم کہتا ہے اخلاق کی اصلاح ہو سکتی ہے۔ فرماتا ہے **فَذَکِّر اِن نَفَعَت الذِکریٰ** (۸۷-۱۰) اِن کے معنی قد کے ہیں۔ کہ اے محمدؐ (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) تو لوگوں کو نصیحت کر کہ نصیحت ہمیشہ ہی فائدہ مند ثابت ہوتی ہے۔ پس قرآن کریم کی اس آیت کے ماتحت اخلاق کی اصلاح ہر حالت میں ہو سکتی ہے۔

حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اس بارے میں جو ارشاد جماعت کو کیا ہے وہ اپنی ذات میں ایک معجزہ ہے۔ بلکہ اتنا بڑا معجزہ ہے کہ وہی آپ کی صداقت کے ثبوت کے لئے کافی ہے۔ قرآن کریم کو چھوڑ کر کہ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے علم کا وہی منبع ہے اور کسی نے اِس حقیقت کو بیان نہیں کیا۔ آپ نے ایسے الفاظ میں ارشاد فرمایا ہے کہ وہ دل کو اُمید سے پُر کر دیتے ہیں۔ آپ جماعت کو مخاطب کر کے فرماتے ہیں:

> **"یہ خیال نہ کرو کہ ہم گنہگار ہیں۔ ہماری دُعا کیونکر قبول ہوگی۔ انسان خطا کرتا ہے مگر دعا کے ساتھ آخر نفس پر غالب آ جاتا ہے اور نفس کو پامال کر دیتا ہے۔ کیونکہ خدا تعالیٰ نے انسان کے اندر یہ قوت بھی فطرتاً رکھ دی ہے کہ وہ نفس پر غالب آ جائے۔ دیکھو پانی کی فطرت میں یہ بات رکھی گئی ہے کہ وہ آگ کو بجھا دے۔ پس پانی کو کیسا ہی گرم کرو اور آگ کی**

طرح کردو۔ پھر بھی جب وہ آگ پر پڑیگا تو ضرور ہے کہ آگ کو بجھادے جیسا کہ پانی کی فطرت میں برودت ہے ایسا ہی انسان کی فطرت میں پاکیزگی ہے۔ ہر ایک شخص میں خدا تعالیٰ نے پاکیزگی کا مادہ رکھ دیا ہوا ہے۔اس سے مت گھبراؤ کہ ہم گناہ سے ملوث ہیں۔گناہ اس میل کی طرح ہے جو کپڑے پر ہوتی ہے اور دور کی جاسکتی ہے۔تمہارے طبائع کیسے ہی جذبات نفسانی کے ماتحت ہوں خدا تعالیٰ سے رورو کر دُعا کرتے رہو تو وہ ضائع نہ کریگا۔وہ حلیم ہے۔وہ غفور رحیم ہے۔''

(بدر ۱۷رجنوری ۱۹۰۷ءتقریر جلسہ سالانہ)

یہ ایسا پُر اُمید پیغام ہے کہ گو اجمالی طور پر قرآن کریم میں پایا جاتا ہے مگر اور کسی کتاب میں اس کو اس رنگ میں نہیں بیان کیا۔جس رنگ میں کہ حضرت مسیح موعودؑ نے اجمال کے طور پر قرآن کریم سے اس بیش بہاء تعلیم کو لیا ہے اور کسی کتاب نے بیان نہیں کیا۔اور تشریح کو مدّ نظر رکھا جائے تو حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے کمال کر دیا ہے۔

اُوپر کی عبارت سے ظاہر ہوتا ہے کہ انسان میں ایسا مادہ ہے کہ جب بھی اسکو کام میں لایا جائے سب گناہوں کو دور کر دیتا ہے اور اصلاح کر دیتا ہے۔

فطرت کا میلان نیکی کی طرف ہے یا بدی کی طرف

اِس جگہ یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا پھر فطرت کا سیلان نیکی کی طرف ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ فطرت کا میلان نہ نیکی کی طرف ہے نہ بدی کی طرف۔ہاں اللہ تعالیٰ نے انسان کو اعلیٰ سے اعلیٰ قابلیتیں دیکر بھیجا ہے اور اسے مقدرت دی ہے کہ وہ انہیں نیک و بدطور پر استعمال کر سکے۔ پھر وہ اسے سیدھا راستہ دکھا کر چھوڑ دیتا ہے۔جیسا کہ فرماتا ہے: **انّا ھدینٰہ السّبیل اِمّا شاکراً و اِمّا کفوراً.** یعنی ہم نے انسان کو ہر رنگ کی طاقت دیکر قدرت دے دی ہے۔چاہے کافر بنے چاہے شکر گذار۔

دُنیا میں اکثر بدی کیوں ہے؟

یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر انسان میں یہ طاقت ہے کہ بدی کو دبا سکتا ہے تو دُنیا میں بدی کیوں زیادہ ہے اور نیکی کیوں کم ہے؟

اِس سوال کا جواب مَیں نے پہلے بھی اپنی ایک تقریر میں دیا تھا۔ مگر پچھلے دنوں چار پانچ آدمیوں نے مختلف مقامات سے یہ سوال لکھ کر بھیجا ہے۔ نہ معلوم ایک ہی وقت میں یہ سوال کس طرح پیدا ہو گیا ہے۔

اصل بات یہ ہے کہ دُنیا میں بُرائی زیادہ نہیں بلکہ نیکی زیادہ ہے۔ دیکھو ایک چور جس میں چوری کی بُرائی پائی جاتی ہے وہ اگر کئی نیک کام کرے۔ مثلاً خوش خلق ہو، سخی ہو، ماں باپ کی خدمت کرنیوالا ہو تو اس میں نیک خلق زیادہ ہوئے یا بُرے۔ پس اگر اخلاق کو مدّ نظر رکھ کر دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ بداخلاقی کم ہوگی اور نیک اخلاق زیادہ ہونگے۔ اکثر نیک اخلاق لوگوں میں پائے جائینگے۔ اور بداخلاقیاں کم ہونگی۔ یہ شُبہ کہ دُنیا میں بُرائیاں بہ نسبت نیکیوں کے زیادہ ہیں دو وجہ سے پیدا ہوتا ہے۔ ایک تو اِس وجہ سے کہ لوگ دیکھتے ہیں۔ دُنیا میں کافر زیادہ ہوتے ہیں اور مؤمن کم۔ اور دوسرے اس وجہ سے کہ لوگ دیکھتے ہیں کہ اکثر انسانوں میں کچھ عیوب نظر آتے ہیں لیکن یہ دونوں اُمور ہرگز ثابت نہیں کرتے کہ دُنیا میں بدی زیادہ ہے۔ بلکہ باوجود اِن دونوں اُمور کے دُنیا میں نیکی زیادہ ہے۔ اگر پہلی بات کو یعنی اس امر کو کہ دُنیا میں کافر زیادہ ہیں لیا جائے تو غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ یہ ایک دھوکہ ہے جو حقیقت پر غور نہ کرنے سے پیدا ہوا ہے۔ حقیقت یہ نہیں کہ دُنیا میں کافر زیادہ ہیں بلکہ حقیقت یہ ہے کہ دُنیا میں کافر کہلانیوالے زیادہ ہیں۔ کیونکہ اگر تحقیق کی جائے تو دُنیا میں سے اکثر آدمی وہی ملیں گے جن پر باطنی حجت پوری نہیں ہوئی۔ پس گو ان کا نام ظاہر شریعت کی بناء پر کافر رکھا جائے خدا تعالیٰ کے نزدیک ان میں کفر کی حقیقت نہیں پائی جاتی بلکہ ان لوگوں کو خدا تعالیٰ یا پھر موقع دیگا یا ان کے فطری اعمال یعنی شرک و توحید کی بناء پر انہیں سزا یا جزا دیگا۔ پس حقیقت کو مدّ نظر رکھتے ہوئے اصل میں ایمان ہی زیادہ

ہے اور اسی نسبت سے نیکی بدی کی نسبت زیادہ ہے۔

دوسری وجہ بھی کہ اکثر لوگوں میں کمزوریاں نظر آتی ہیں، باطل ہے۔ کیونکہ سوال یہ نہیں کہ اکثر لوگوں میں کمزوریاں نظر آتی ہیں بلکہ سوال یہ ہے کہ اکثر لوگوں میں بدیاں نظر آتی ہیں یا نیکیاں اگر اکثر لوگوں میں اکثر نیکیاں نظر آتی ہیں تو نیکی دُنیا میں زیادہ ہوئی۔ اور ہر شخص جو انسانوں کے مجموعی اعمال پر نظر کریگا اُسے معلوم ہوگا کہ انسانوں کے اعمال کو مجموعی طور پر دیکھ کر یہی ثابت ہوتا ہے کہ لوگوں میں اکثر نیکیاں ہیں اور کم بدیاں ہیں۔ پس دُنیا میں بدی کم ہوئی اور نیکی زیادہ۔

بعض لوگ اِس موقع پر کہہ دیتے ہیں کہ خواہ کچھ ہوا گر اکثر لوگوں کو سزا ملنی ہے تو پھر شیطان جیتا۔ مَیں کہتا ہوں نہیں، پھر بھی خدا ہی جیتا۔ اور وہ اس طرح کہ خدا تعالیٰ کا ایک قانون یہ بھی ہے کہ سزا بھگت کر سارے کے سارے انسان جنت میں چلے جائیں گے۔ چنانچہ قرآن کریم کہتا ہے۔ **وما خلقت الجنّ والانس الّا لیعبدون**. مَیں نے انسانوں کو اسلئے پیدا کیا ہے کہ وہ میرے بندے بن جائیں۔ اب یہ کس طرح ممکن ہے کہ لوگ خدا کے بندے بنکر بھی سزا میں پڑے رہیں۔ پس معلوم ہوا کہ ایک وقت سب کے سب دوزخ سے نکالے جائینگے۔ چنانچہ دوسری آیات اور احادیث سے بھی یہ معلوم ہوتا ہے کہ کسی وقت سب کے سب لوگ جنت میں چلے جائینگے۔ اس لئے سارے خدا کے عبد ہو گئے اور خدا ہی جیتا۔ پھر شیطان بھی کہاں بیٹھا رہے گا۔ وہ بھی جنت میں چلا جائیگا۔ اس طرح وہ اپنے نفس کے لحاظ سے بھی ہار گیا۔ اب وہ جو کہتے ہیں شیطان جیتا وہ شیطان کو بھی جنت میں دیکھ کر شرمائیں گے کہ ہم تو اسے جتا رہے تھے یہ خود بھی یہیں آ گیا۔

اب پھر مَیں باکمال انسان کی تعریف دُہراتا ہوں۔ باکمال وہ انسان ہے جو اِس حد تک گناہ سے بچے کہ اسکی رُوح ہلاکت اُخروی سے بچ جائے (ہلاکتِ اُخروی سے مراد خدا تعالیٰ کی ناراضی ہے) اور اِس حد تک نیکی کرے کہ خدا تعالیٰ کی رضاء کی طرف قدم مارنے کی فوری قوّت اس میں پیدا ہو جائے۔ ورنہ یوں تو یہ قوت سب میں پیدا ہوگی۔

گناہ کیا ہے؟

اَب مَیں یہ بتاتا ہوں کہ گناہ کیا ہے۔ گناہ وہ عمل ہے کہ جس سے انسان کی روح بیمار ہو جاتی ہے اور رویتِ الٰہی کے قابل نہیں رہتی اور اس کے لئے اس سفر میں دقتیں پیدا ہو جاتی ہیں جس کے لئے اُسے پیدا کیا گیا ہے۔ ان اعمال میں سے بعض مادی ہیں اور بعض رُوحانی۔ جو مادی ہیں ان میں سے اکثر ایسے ہیں کہ جن کی مضرات نظر آتی ہیں۔ جیسے جھوٹ، قتل وغیرہ کے ارتکاب کا نقصان عیاں ہوتا ہے۔

نیکی کیا ہے؟

نیکی وہ اعمال ہیں کہ جن سے انسانی رُوح کو اتنی صحت حاصل ہو جائے کہ وہ رویت الٰہی کے قابل ہو جائے۔ تندرست آدمی کا یہی مفہوم ہوتا ہے کہ وہ کام کاج کر سکے ورنہ ڈاکٹر تو ہر ایک میں کوئی نہ کوئی بیماری بتا دیگا۔ پس نیکی یہ ہے کہ رویتِ الٰہی کی قابلیت انسان میں پیدا ہو جائے۔ اس میں بھی روحانی اور مادی دونوں قسم کے افعال شامل ہیں۔

گناہ کی اقسام

اصل مضمون کے سمجھنے کے لئے یہ بات سمجھنی بھی ضروری ہے کہ گناہ کی اقسام کتنی ہیں۔ سو یاد رکھو کہ اس کی تین اقسام ہیں (۱) دل کا گناہ، یہ اصل گناہ ہے (۲) زبان کا گناہ (۳) جوارح یعنی ہاتھ اور پاؤں اور دیگر اعضاء کا گناہ۔

نیکی کی کتنی اقسام ہیں

نیکی کی اقسام بھی تین ہی ہیں (۱) دل کی نیکی۔ یہ اصل ہے (۲) زبان کی نیکی (۳) جوارح کی نیکی۔

نیکی کی اِسقدر طاقتوں کی موجودگی میں گناہ کہاں سے آتا ہے؟

اُوپر کے بیان کو پڑھ کر یہ خیال ہوسکتا ہے کہ جب بندہ کی ترقی کے لئے خدا تعالیٰ نے اسقدر طاقتیں رکھی ہیں تو گناہ کہاں سے آتا ہے۔ اِسکا جواب یہ ہے کہ گناہ کی ابتداء مندرجہ ذیل امور سے ہوتی ہے: (۱) جہالت یا عدمِ علم سے۔ یعنی بعض دفعہ انسان طبعی تقاضوں کے پورا کرنے میں قوتِ فکر سے کام نہیں لیتا اور عارضی خوشی کو مقدم کرلیتا ہے۔ پس عارضی خوشی دائمی راحت سے اس کی نظر کو ہٹا دیتی ہے۔ اس کے موجبات یہ ہیں:

اوّل جہالت مستقل ہو یا عارضی۔ جہالت مستقل تو ظاہر ہی ہے۔ عارضی جہالت یعنی باوجود علم کے ایک وقت میں جاہل کی طرح ہو جائے۔ اسکے مندرجہ ذیل اسباب ہیں (۱) لالچ اس سے بھی جہالت پیدا ہوتی ہے۔ (۲) غصّہ (۳) سخت ضرورت (۴) صحت کی خرابی (۵) سخت خوف (۶) سخت محبت۔ اس سے بھی جہالت پیدا ہوتی ہے۔ (۷) انتہائی اُمید (۸) سخت مایوسی (۹) ضِد (۱۰) خواہش کی زیادتی (۱۱) یا کمی (۱۲) ورثہ یعنی بعض خیالات ورثہ سے ملتے ہیں اور بسا اوقات دوسرے تمام خیالات پر پردہ ڈال دیتے ہیں۔ یہ بارہ ذریعہ ہیں جن سے جہالت پیدا ہوتی ہے۔

(۲) دوسری چیز جس سے گناہ پیدا ہوتا ہے وہ صحبت کا اثر ہے۔ انسان کے اندر نقل کی طاقت رکھی گئی ہے۔ وہ اپنے اردگرد جو کچھ دیکھتا ہے اس کی نقل کرتا ہے اور اس کے نتائج پر غور نہیں کرتا۔ صحبت کا اثر زیادہ تر ماں باپ یا دوسرے رشتہ داروں کی طرف سے، کھیلنے والوں کی طرف سے اور اُستادوں کی طرف سے پڑتا ہے۔ قومی رسوم سے جو اثر انسان پر پڑتا ہے وہ بھی اسی قسم میں شامل ہے۔

(۳) گناہ کا ایک موجب غلط عِلم بھی ہے۔ ایسی باتوں کو انسان علم سمجھ لیتا ہے جو علم نہیں ہوتیں۔ ایسے اُصول پر عمل کرتا ہے جو غلط ہوتے ہیں۔

(۴) گناہ کا ایک موجب عادت بھی ہے۔ باوجود اس کے کہ انسان سچائی سے واقف ہوتا

ہے مگر جب موقع آتا ہے اس بُرائی سے بچ نہیں سکتا۔ مثلاً جانتا ہے کہ شراب پینا بُرا ہے اور ارادہ کرتا ہے کہ نہیں پیونگا۔ لیکن باہر جاتا ہے۔ بادل آیا ہوتا ہے۔ ایک ایسی صحبت میں جا کر بیٹھتا ہے جہاں شراب اُڑ رہی ہے۔ وہاں دوسرے کہتے ہیں لو تم بھی پیو۔ تو اس نے نہ پینے کے متعلق جو ارادہ کیا تھا وہ ٹوٹ جاتا ہے۔

(۵) گناہ کا ایک موجب سُستی اور غفلت ہے۔ ایک بات کا علم ہوتا ہے۔ عادت بھی نہیں ہوتی۔ مگر باوجود اسکے کام کرنے کی امنگ نہیں ہوتی۔ کہتا ہے پھر کر لینگے۔ اسی میں وقت گذر جاتا ہے اور وہ بُرائی میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے وقت میں ایک ایسا ہی واقعہ ہوا۔ ایک مخلص صحابی تھے جو جنگ کے لئے جانے کی تیاری کرنے کی بجائے اس خیال سے بیٹھے رہے کہ جب چاہونگا چل پڑونگا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ لشکر کے ساتھ نہ جا سکے۔ غرض کبھی سُستی سے بھی انسان گناہ میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ ایسے انسان کے اندر یہ مادہ نہیں ہوتا کہ اُسے مجبور کرے کہ اُٹھو یہ کام کرو۔

(٦) گناہ کا ایک موجب عدم موازنہ بھی ہے۔ یعنی یہ فیصلہ کرنیکی طاقت نہ رکھنا کہ یہ کام اچھا ہے یا وہ۔ یا یہ فلاں جذبہ کو کس حد تک کس سے اور کس حد تک کس سے استعمال کرنا چاہئے۔ مثلاً محبت ایک اچھا جذبہ ہے لیکن ایک شخص بیوی سے زیادہ محبت کرے اور ماں سے کم حالانکہ ماں کا اس پر احسان ہے۔ وہ اس کے عدم سے وجود میں لانے کا باعث ہوئی ہے اور بیوی سے اسکا تعاون کا رشتہ ہے۔ وہ صرف اسکی خواہشات کو پورا کرتی ہے۔ یا جیسے آجکل بعض لوگ کہتے ہیں حضرت مرزا صاحبؑ سچے ہیں مگر ہم فلاں پیر کے ہاتھ میں ہاتھ دے چکے ہیں۔ یہ سب باتیں قوتِ فیصلہ کی کمی کی وجہ سے ہوتی ہیں۔

(۷) گناہ کا ایک موجب اس زمانہ کے خیالات کی مخفی رو بھی ہے۔ باقی اُمور کی مَیں نے تفصیل نہیں بیان کی مگر اسکی بیان کرونگا۔ کیونکہ تفصیل کے بغیر آپ لوگ اسے سمجھ نہیں سکتے۔

بلا اسکے کہ کوئی تحریک کرے یا منوانے کے لئے دلیل دے۔ جب کسی خیال کی رو دُنیا میں چلیگی تو وہ متاثر کریگی۔ دس بدمعاشوں میں ایک اچھے انسان کو بٹھا دو، وہ بدمعاش خواہ دل میں

بدی رکھیں اور اس پر ظاہر نہ کریں تو بھی اسکے دل پر بُرائی کا اثر ہونا شروع ہو جائیگا۔ ایک دفعہ ایک سِکھ لڑکا جسے حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام سے اخلاص تھا۔ اس نے حضرت خلیفہ اوّل ؓ کی معرفت حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کو پیغام بھیجا کہ میرے دل میں کچھ دنوں سے دہریت کے خیالات پیدا ہو رہے ہیں۔ جب حضرت خلیفہ اوّل ؓ نے یہ بات حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کو سُنائی تو آپؑ نے فرمایا اسے کہو کالج میں جہاں اسکی سیٹ ہے اُسے بدل لے۔ اُس نے ایسا ہی کیا اور بعد میں پتہ لگا۔ جس دن سے اُس نے سیٹ تبدیل کی اُسی دن سے اس کے خیالات میں اصلاح ہونی شروع ہو گئی۔ اسکی وجہ یہ تھی کہ اسکے دل میں دہریت کے خیالات پیدا ہونے کا سبب ایک دہریہ لڑکے کا قرب تھا۔ بغیر اسکے کہ وہ لڑکا اپنے خیالات کو ظاہر کرتا اس کے دلی خیالات کا اثر اُس سکھ لڑکے پر پڑتا رہا تھا۔

پس خیالات کی رَو ایسی چیز ہے کہ جس کا کوئی انکار نہیں کر سکتا۔ اور یہ بات قرآن کریم اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے بھی ثابت ہے۔ اسکی مثال حیوانوں میں بڑی وضاحت کے ساتھ ملتی ہے۔ کئی دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ دو بلّیاں آپس میں لڑنے لگتی ہیں لیکن تھوڑی دیر غوں غوں کرنے کے بعد ان میں سے ایک اپنی دُم نیچی کر کے چلی جاتی ہے اور لڑائی نہیں ہوتی۔

اِسی طرح شیروں کے متعلق تجربہ کیا گیا ہے۔ چار پانچ کو اکٹھا ایک جگہ چھوڑ دیا جائے تو ان میں سے جو سب سے زبردست ہوگا وہ کھڑا رہیگا اور باقی اپنی دُمیں نیچی کر کے ادھر ادھر سرک جائیں گے۔ اس وقت اگر ان کے درمیان گوشت ڈالا جائے تو صرف وہی کھائیگا جو زبردست ہوگا۔ اور باقی بغیر پنجہ مارے چپکے کھڑے رہیں گے۔

مسمریزم جو خیالات کی رَو سے ہی متاثر کو نیوالا علم ہے اسکے متعلق مَیں ایک دفعہ تجربہ کر رہا تھا تا کہ اس علم کے ذریعہ رُوحانیت پر جو اعتراض کئے جاتے ہیں انکا جواب دیا جا سکے۔ اسوقت ہماری نانی امّاں صاحبہ نے کہا۔ یہ یونہی باتیں ہیں، یہ سامنے چڑیا بیٹھی ہے اسے پکڑ کر دکھا دو تو جانیں۔ چڑیا دو اڑھائی گز کے فاصلہ پر بیٹھی تھی۔ مَیں نے اسکی آنکھوں میں آنکھیں ڈالکر اُسے متاثر کیا اور اُس کے پاس چلا گیا۔ لیکن جب مَیں نے اُسے پکڑنے کے لئے ہاتھ ڈالا تو چونکہ میرا

ہاتھ میری اوراُس کی آنکھوں کے درمیان آ گیا اس لئے وہ ہاتھ سے نکل کر اُڑ گئی۔

ایک سیاح لکھتا ہے۔مَیں نے جنگل میں دیکھا کہ ایک گلہری بے تحاشہ دوڑ رہی ہے مگر دور نہیں جاتی۔ہر پھر کر اسی جگہ آ جاتی ہے۔مَیں نے قریب جا کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ ایک سانپ سر نکالے اس کی طرف دیکھ رہا ہے۔آخر وہ بالکل اسکے نزدیک چلی گئی اور سانپ اُسے منہ میں ڈالنے ہی والا تھا کہ مَیں نے اُسے کوڑا مارا اور وہ بھاگ گیا۔یہ سانپ کے خیالات کا ہی اثر تھا کہ وہ گلہری بھاگ کر دور نہ جاسکتی تھی اور آخر بالکل قریب آ گئی۔

ایک اور سیاح لکھتا ہے۔افریقہ کے ایک جنگل میں مَیں نے دیکھا کہ ایک پرندہ پھڑ پھڑا رہا ہے قریب جا کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ سانپ اس کی طرف نظر جمائے بیٹھا ہے۔مَیں نے سانپ کو مار دیا بعد میں دیکھا تو وہ جانور بھی اس خوف اور صدمہ سے کہ مَیں پکڑا جاؤنگا۔مرا پڑا تھا۔

انگلستان میں ایک اور طریق سے تجربہ کیا گیا ہے۔اور وہ اس طرح کہ ایک جنس کے دو کیڑے لائے گئے۔ان میں سے ایک پانچ میل کے فاصلہ پر رکھ دیا گیا مگر وہ دوسرے کیڑے کے پاس خود بخود پہنچ گیا۔یہ خیالات کی رَو کا ہی نتیجہ تھا۔

امریکہ کے ایک ڈاکٹر نے چیونٹیوں کا گھر بنایا جسے چاروں طرف سے بند کر دیا۔اسکے بعد دیکھا گیا کہ باہر کی طرف سے چیونٹیاں چمٹی ہوئی تھیں۔جب اس کمرہ کو کھولا گیا تو معلوم ہوا کہ اسی جگہ چیونٹیاں چمٹی ہوئی تھیں جس طرف چیونٹیوں کا گھر تھا۔پھر اسے اٹھا کر دوسری جگہ رکھ دیا گیا اور چیونٹیاں ادھر ہی جا چمٹیں۔حالانکہ درمیان میں دیوار حائل تھی۔

اِن واقعات سے ثابت ہے کہ خیالات کی رَو ایک زبردست طاقت ہے۔رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے بھی ثابت ہے کہ جب آپ کسی مجلس میں بیٹھتے تو ستر بار استغفار پڑھتے۔اس کا یہ مطلب نہیں کہ آپؐ ڈرتے تھے کہ آپؐ گندے نہ ہو جائیں لیکن یہ ضرور ہے کہ نبی گندگی کے پاس آنا بھی پسند نہیں کرتے اس لئے آپؐ بھی استغفار پڑھتے تھے کہ گندگی دور ہی رہے۔پھر بعض لوگ ایسے بھی مجلس میں بیٹھے ہوئے ہوتے ہیں جو خود گندے نہیں ہوتے مگر دوسروں کا اثر

قبول کرنے کے لئے تیار رہتے ہیں۔پس آپ اس لئے بھی استغفار پڑھتے تھے کہ ان پر کسی گندگی کا اثر نہ ہو۔

گناہ آلود حالتیں

گناہ کے خلاف جدّ و جہد کرنے کے لئے گناہ آلود حالتوں کا جاننا بھی نہایت ضروری ہے اسلئے اب میں گناہ آلود حالتوں کا بھی اِس جگہ ذکر کر دیتا ہوں۔

پہلی حالت یہ ہے کہ انسان گناہ کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتا ہے مگر کبھی کبھی اس سے گناہ سرزد ہو جاتا ہے۔

دوسری حالت یہ ہے۔گناہ کو بُرا تو سمجھتا ہے مگر اکثر لالچوں کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔اور گناہ میں مبتلا ہو جاتا ہے۔

تیسری حالت یہ ہے کہ انسان گناہ کو بُرا تو نہیں سمجھتا مگر گناہ کی خواہش بھی نہیں ہوتی۔یعنی اگر موقعہ پیش آجائے تو گناہ سے نفرت بھی نہیں کرتا۔

چوتھی حالت یہ ہے کہ انسان گناہ کو پسند کرتا ہے مگر اس میں حیا کا مادہ ہوتا ہے اِس لئے پوشیدہ گناہ کرتا ہے۔اور اگر گناہ سے رُکتا ہے تو عادت یا رسم کی وجہ سے رُکتا ہے۔

پانچویں حالت یہ ہوتی ہے کہ انسان عادت اور رسم کو توڑ کر گناہ کے ارتکاب پر دلیر ہو جاتا ہے اور گناہ کو پسند کرتا ہے۔

چھٹی حالت یہ ہوتی ہے کہ انسان دوسروں کو بدی کی ترغیب دیتا اور اسے اچھا قرار دیتا ہے۔

ساتویں حالت یہ ہوتی ہے کہ انسان شیطان کا بروز ہو جاتا ہے اور اس کا مقصد ہی بدی پھیلانا ہو جاتا ہے۔

اس کے مقابلہ میں نیکی کی یہ حالتیں ہیں:

اوّل: بہ خواہشِ ثواب نیکی کرنا۔دوم: بطور فرض نیکی کرنا کہ خدا کا حکم ہے۔سوم: نیکی کو نیکی

کی خاطر کرنا۔ چہارم: نیکی کو بطور عادت کرنا۔ پنجم: نیکی میں ہی اپنی خوشی پانا۔ ششم: دُنیا میں نیکی پھیلانے کی کوشش کرنا۔ ہفتم: نیکی کا مجسم ہو جانا اور نیکی کے پھیلانے کو اپنا مقصدِ وحید قرار دے لینا۔ یعنی ملائکہ کی طرح ہو جانا۔

اس کے اوپر اور بھی درجے ہیں۔ مگر وہ کسبی نہیں بلکہ وہبی ہیں۔ یعنی نبوت کے مدارج۔

مَیں اوپر بتا آیا ہوں کہ اخلاق اور روحانیت میں صرف اس قدر فرق ہے کہ وہی صفات جب بندوں کے متعلق استعمال ہوں تو اخلاق کہلاتی ہیں۔ اور جب خدا تعالیٰ کے متعلق استعمال ہوں تو روحانیت۔ اس لئے جو اصولی علاج ایک کا ہوگا وہی دوسرے کا۔ اس لئے مجھے اخلاقی اور روحانی بیماریوں کے علاج الگ بتائے جانے کی ضرورت نہیں ہے اور نہ مَیں اس جگہ ان علاجوں کے بیان کرنے کی گنجائش پاتا ہوں۔ جو دوسرے مذاہب نے بیان کئے ہیں یا صوفیاء نے بیان کئے ہیں۔ اس لئے مَیں اوپر کی ابتدائی تشریحوں کے بعد میں گناہ کے علاج کے متعلق وہ اسلامی تعلیم جو میری سمجھ میں آئی ہے بیان کرتا ہوں:

اسلام نے علاجِ گناہ کے متعلق گناہ پیدا ہونے کے بعد اس کا علاج کس طرح کیا جائے؟ کے سوال سے پہلے یہ سوال اُٹھایا ہے کہ کیا احتیاط کی جائے کہ گناہ پیدا ہی نہ ہونے پائے۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ اس سوال کے جواب میں گناہ کے دور کرنے کی کنجی ہے۔ کپڑے کے میلا ہو جانے کے بعد اس کے دھونے سے کیا یہ بہتر نہیں کہ ہم ایسی تدبیر اختیار کریں کہ وہ میلا ہی نہ ہو۔ اس میں کیا شک ہے کہ یہ سب سے بہتر اور ضروری امر ہے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ اسلام نے دوسرے مذاہب کے برخلاف صرف اسی طرف توجہ نہیں دلائی۔ کہ گناہ کا قلع قمع کس طرح کیا جائے۔ بلکہ اِس طرف بھی توجہ دلائی ہے کہ سب سے پہلے یہ کوشش کرو کہ گناہ پیدا ہی نہ ہو۔

مگر مَیں افسوس سے کہتا ہوں کہ باوجود اس کے کہ قرآن کریم نے ادھر توجہ دلائی اور بعض اسلامی بزرگوں نے بھی اس پر زور دیا ہے۔ بحیثیت قوم مسلمانوں نے ادھر پوری توجہ نہیں کی۔ اور اِس امر کو نظر انداز کر دیا ہے کہ گناہ انسان کے بلوغ سے پہلے پیدا ہوتا ہے۔ جب لوگ یہ کہتے ہیں کہ فلاں اب گناہ کرنے لگا ہے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ گناہ کا بیج جو اس کے اندر تھا۔ وہ

درخت بن کر ظاہر ہو رہا ہے۔ ورنہ کیا یہ ہوسکتا ہے کہ بیج نہ ہو اور درخت پیدا ہو جائے ہرگز نہیں۔ اگر گناہ کی قابلیت پہلے ہی نہ تھی تو پھر وہ بالغ ہونے پر کہاں سے آ گئی۔ پس اصل بات یہ ہے کہ گناہ بچپن سے پیدا ہوتا ہے اور ہر ایک بدی بلوغ سے پہلے انسان کے دل میں جاگزین ہو جاتی ہے۔ بلکہ بعض دفعہ تو پیدا ہونے سے بھی پہلے بعض بدیوں کی ابتدا شروع ہو جاتی ہے۔ جب ایک شخص بالغ ہو جاتا ہے اور علماء کہتے ہیں اسے بدیوں سے بچاؤ۔ تو اس وقت وہ شخص پورے طور پر شیطان کے قبضہ میں جا چکا ہوتا ہے۔ میرے اِس کہنے کا یہ مطلب نہیں کہ اس میں سب بدیاں پائی جاتی ہیں بلکہ یہ ہے کہ اس میں گناہ کی طاقت اور ان کا شکار ہو جانے کا میلان پیدا ہو چکا ہوتا ہے۔ مَیں پہلے بتا چکا ہوں کہ اخلاق مادہ کی چند خاصیتوں سے پیدا ہوتے ہیں۔ وہی میلان اگر بچپن میں خراب ہو جائیں تو گو بچہ بالکل بے گناہ نظر آئے۔ مگر اس کے اندر گناہ کے ارتکاب کا پورا سامان موجود ہوگا۔

اب ذرا سوچو تو سہی کہ گناہ کہاں سے پیدا ہوتا ہے۔ کیا گناہ ورثہ سے نہیں پیدا ہوتے؟ وہ قومیں جو کوئی خاص کام کرنے والی ہوتی ہیں اسی قسم کا میلان ان کی اولاد میں پایا جاتا ہے۔ ایک ایسی قوم جس میں نسلاً بعد نسلٍ بہادری کی رُوح نہ ہو اور اُسے بہادر بنانے کی کوشش کی جائے وہ لڑائی کے وقت ضرور بُزدلی دکھائے گی۔ یا ویسی بہادری نہیں اس سے ظاہر ہوگی جیسی کہ ایک نسلی بہادر قوم سے ظاہر ہوگی۔ تو گو اس قسم کی باتوں کی اصلاح ہوسکتی ہے۔ مگر پھر بھی ورثہ کا اثر ضرور ہوتا ہے۔

اِسی طرح گناہ لالچ، غصّہ، ڈر، محبت، خواہش کی زیادتی وغیرہ سے پیدا ہوتا ہے۔ اب غور کرو کیا یہ وہی خصلتیں نہیں جو بچپن میں ہی بچہ سیکھتا ہے۔ کیا وہ اس کی چھوٹی چھوٹی بے ضرر نظر آنیوالی عادتیں ہی نہیں ہیں جو سارے گناہوں کا موجب ہوتی ہیں۔ ماں باپ کہتے ہیں کہ جی بچہ ہے۔ اس لئے فلاں فلاں فعل کرتا ہے۔ مگر کیا بچپن ہی کا زمانہ وہ زمانہ نہیں ہے جب سب سے زیادہ گہری جگہ پکڑنے والے نقش جمتے ہیں۔ ایک شخص جو کسی کا مال چوری کر کے لے جاتا ہے اسے اگر بچپن میں اپنے نفس پر قابو کرنا سکھایا جاتا تو وہ بڑا ہو کر چوری کا کیوں مرتکب ہوتا۔ ایک

شخص جہاد کے لئے جاتا ہے مگر دشمن سے ڈر کر بھاگ آتا ہے لوگ کہتے ہیں کیسا خبیث ہے۔مگر غور کرو کیا اُسے وہی بُزدلی پیدا کرنے والے قصّے نہیں بھگالائے جو ماں اُسے بچپن میں سُنایا کرتی تھی۔

اِسی طرح غصّہ ہے۔بچپن میں ماں باپ خیال نہیں رکھتے اس وجہ سے بچہ بڑا ہو کر ہر ایک سے لڑتا پھرتا ہے۔

پھر کیا گناہ قوتِ ارادی کی کمی سے پیدا نہیں ہوتا؟ اور کیا یہ کمی کسی سبب کے بغیر ہی پیدا ہو جاتی ہے۔آخر وجہ کیا ہے؟ کہ انسان ساری عمر ارادے کر کر کے توڑتا رہتا ہے مگر اس سے کچھ نہیں بنتا۔ یہ ارادہ کی کمی ایک ہی دن میں تو نہیں پیدا ہو جاتی۔ بلکہ یہ بھی بچپن میں اور صرف بچپن میں پیدا ہوتی ہے۔ورنہ کیا سبب ہے کہ باوجود سچی خواہش کے کہ مَیں فلاں بدی کو چھوڑ دوں یہ اسے چھوڑ نہیں سکتا۔اگر تربیت خراب نہ ہوتی تو انسان کی اصلاح کے لئے صرف اس قدر کہہ دینا کافی تھا کہ فلاں بات بُری ہے اور وہ اسے چھوڑ دیتا۔اور وہ بات اچھی ہے اور وہ اسے اختیار کر لیتا۔

اَب مَیں اس نقص سے اولاد کو محفوظ کرنیکا طریق بتاتا ہوں۔ پہلا دروازہ جو انسان کے اندر گناہ کا کھلتا ہے وہ ماں باپ کے اُن خیالات کا اثر ہے جو اُس کی پیدائش سے پہلے اُن کے دلوں میں موجزن تھے۔اور اس دروازہ کا بند کرنا پہلے ضروری ہے۔پس چاہئے کہ اپنی اولادوں پر رحم کر کے لوگ اپنے خیالات کو پاکیزہ بنائیں۔لیکن اگر ہر وقت پاکیزہ نہ رکھ سکیں تو اسلام کے بتائے ہوئے علاج پر عمل کریں تا اولاد ہی ایک حد تک محفوظ رہے۔اسلام ورثہ میں ملنے والے گناہ کا یہ علاج بتاتا ہے کہ جب مرد و عورت ہم صحبت ہوں تو یہ دُعا پڑھیں: اَللّٰهُمَّ جَنِّبْنَا الشَّيْطٰنَ وَجَنِّبِ الشَّيْطٰنَ مَا رَزَقْتَنَا. اے خدا ہمیں شیطان سے بچا اور جو اولاد ہمیں دے اُسے بھی شیطان سے محفوظ رکھ۔

یہ کوئی ٹونا نہیں۔ جادو نہیں اور ضروری نہیں کہ عربی کے الفاظ ہی بولے جائیں۔ بلکہ اپنی زبان میں انسان کہہ سکتا ہے کہ الٰہی گناہ ایک بُری چیز ہے اس سے ہمیں بچا اور بچہ کو بھی بچا۔اُس وقت کا یہ خیال اس کے اور بچہ کے درمیان دیوار ہو جائے گا۔اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم

نے فرمایا ہے۔ یہ دُعا کرنے سے جو بچہ پیدا ہوگا اس میں شیطان کا دخل نہیں ہوگا۔

کئی لوگ حیران ہوں گے کہ ہم نے تو کئی دفعہ دُعا پڑھی مگر اس کا وہ نتیجہ نہیں نکلا جو بتایا گیا ہے۔ مگر ان کے شبہ کا جواب یہ ہے کہ اوّل تو وہ لوگ اس دُعا کو صحیح طور پر نہیں پڑھتے صرف ٹونے کے طور پر پڑھتے ہیں۔ دوسرے سب گناہوں کا اِس دُعا سے علاج نہیں ہوتا بلکہ صرف ورثہ کے گناہوں کے لئے ہے۔

ورثہ کے گناہ کے بعد گناہ کی آمیزش انسان کے خیالات میں اُسکے بچپن کے زمانہ میں ہوتی ہے۔ اس کا علاج اسلام نے یہ کیا ہے کہ بچہ کی تربیت کا زمانہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے وہ قرار دیا ہے جبکہ بچہ ابھی پیدا ہی ہوا ہوتا ہے۔ میرا خیال ہے اگر ہوسکتا تو رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم یہ فرماتے کہ جب بچہ رحم میں ہو اُسی وقت سے اسکی تربیت کا وقت شروع ہو جانا چاہئے۔ مگر یہ چونکہ ہو نہیں سکتا تھا اس لئے پیدائش کے وقت سے تربیت قرار دی اور وہ اس طرح کہ فرما دیا کہ جب بچہ پیدا ہو اسی وقت اس کے کام میں اذان کہی جائے۔ اذان کے الفاظ ٹونے یا جادو کے طور پر بچہ کے کان میں نہیں ڈالے جاتے۔ بلکہ اس وقت بچہ کے کان میں اذان دینے کا حکم دینے سے ماں باپ کو یہ امر سمجھانا مطلوب ہے کہ بچہ کی تربیت کا وقت ابھی سے شروع ہو گیا ہے۔

اذان کے علاوہ بھی رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے بچوں کو بچپن ہی سے ادب سکھانے کا حکم دیا ہے۔ اور اپنے عزیزوں کو بھی بچپن میں ادب سکھا کر عملی ثبوت دیا ہے۔ حدیثوں میں آتا ہے، امام حسنؓ جب چھوٹے تھے تو ایک دن کھاتے وقت آپؐ نے ان کو فرمایا: كُلْ بِيَمِيْنِكَ وَكُلْ مِمَّا يَلِيْكَ. کہ دائیں ہاتھ سے کھاؤ اور اپنے آگے سے کھاؤ۔ حضرت امام حسنؓ کی عمر اس وقت اڑھائی سال کے قریب ہوگی۔ ہمارے مُلک میں اگر بچہ سارے کھانے میں ہاتھ ڈالتا اور سارا مُنہ بھر لیتا ہے بلکہ اردگرد بیٹھنے والوں کے کپڑے بھی خراب کرتا ہے تو ماں باپ بیٹھے ہنستے ہیں اور کچھ پرواہ نہیں کرتے۔ یا یونہی معمولی سی بات کہہ دیتے ہیں۔ جس سے ان کا مقصد بچہ کو سمجھانا نہیں بلکہ دوسروں کو دکھانا ہوتا ہے۔ حدیث میں ایک اور واقعہ بھی آتا ہے کہ ایک دفعہ بچپن میں امام حسنؓ نے صدقہ کی کھجوروں میں سے ایک کھجور مُنہ میں ڈال لی تو رسول کریم صلی اللہ علیہ

وآلہٖ وسلم نے اُن کے منہ میں انگلی ڈال کر نکال لی۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ تمہارا کام خود کام کر کے کھانا ہے۔ نہ کہ دوسروں کے لئے بوجھ بننا۔

غرض بچپن کی تربیت ہی ہوتی ہے جو انسان کو وہ کچھ بناتی ہے جو آئندہ زندگی میں وہ بنتا ہے۔ چنانچہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا: **ما من مولودٍ الّا یُولد علی الفطرۃ فابواہ یھوّ دانہٖ اوینصرّ انہٖ اویمجّسانہٖ** (بخاری ومسلم) کہ بچہ فطرت پر پیدا ہوتا ہے۔ آگے ماں باپ اسے یہودی یا نصرانی یا مجوسی بناتے ہیں۔ اسی طرح یہ بھی سچ ہے کہ ماں باپ ہی اُسے مسلمان یا ہندو بناتے ہیں۔ اس حدیث کا یہ مطلب نہیں کہ جب بچہ بالغ ہو جاتا ہے تو ماں باپ اُسے گرجا میں لیجا کر عیسائی بناتے ہیں۔ بلکہ یہ ہے کہ بچہ ماں باپ کے اعمال کی نقل کر کے اور انکی باتیں سُن کر وہی بنتا ہے جو اسکے ماں باپ ہوتے ہیں۔ بات یہ ہے کہ بچہ میں نقل کی عادت ہوتی ہے۔ اگر ماں باپ اسے اچھی باتیں نہ سکھائیں گے تو وہ دوسروں کے افعال کی نقل کریگا۔ بعض لوگ کہتے ہیں بچوں کو آزاد چھوڑ دینا چاہیئے خود بڑے ہو کر احمدی ہو جائیں گے۔ مَیں کہتا ہوں اگر بچہ کے کان میں کسی اور کی آواز نہیں پڑتی تب تو ہوسکتا ہے کہ جب وہ بڑا ہو کر احمدیت کے متعلق سُنے تو احمدی ہو جائے لیکن جب اور آوازیں اس کے کان میں اب بھی پڑ رہی ہیں اور بچہ ساتھ کے ساتھ سیکھ رہا ہے تو وہ وہی بنے گا جو دیکھے گا اور سُنے گا۔ اگر فرشتے اُسے اپنی بات نہیں سُنائیں گے تو شیطان اس کا ساتھی بن جائے گا۔ اگر نیک باتیں اس کے کان میں نہ پڑیں گی تو بد پڑیں گی اور وہ بد ہو جائیگا۔

پس اگر آپ لوگ گناہ کا سلسلہ روکنا چاہتے ہیں تو جس طرح سگریشن کمپ ہوتا ہے اُس طرح بناؤ اور آئندہ اولاد سے گناہ کی بیماری دُور کر دو تا کہ آئندہ نسلیں محفوظ رہیں۔

تربیت کے طریق

اب مَیں تربیت کے طریق بتاتا ہوں:

(۱) بچہ کے پیدا ہونے پر سب سے پہلے تربیت اذان ہے۔ جس کے متعلق پہلے بتا چکا

ہوں۔

(۲) یہ کہ بچہ کو صاف رکھا جائے۔ پیشاب پاخانہ فوراً صاف کر دیا جائے۔ شاید بعض لوگ یہ کہیں یہ کام تو عورتوں کا ہے۔ یہ صحیح ہے مگر پہلے مَردوں میں یہ خیال پیدا ہوگا تو پھر عورتوں میں ہوگا۔ پس مردوں کا کام ہے کہ عورتوں کو یہ باتیں سمجھائیں کہ جو بچہ صاف نہ رہے اس میں صاف خیالات کہاں سے آئینگے۔ مگر دیکھا گیا ہے اس کی کوئی پرواہ نہیں کی جاتی۔ مجلس میں اگر بچہ کو پاخانہ آئے تو کپڑے پر پھرا کر عورتیں کپڑا بغل میں دبا لیتی ہیں۔ اور قادیان کے اردگرد کی دیہاتی عورتوں کو تو دیکھا ہے، جوتی میں پاخانہ پھرا کرا ادھر اُدھر پھینک دیتی ہیں۔ جب بچہ کی ظاہری صفائی کا خیال نہیں رکھا جاتا تو باطنی صفائی کس طرح ہوگی؟ لیکن اگر بچہ ظاہر میں صاف ہو تو اس کا اثر اس کے باطن پر پڑے گا اور اس کا باطن بھی پاک ہوگا۔ کیونکہ غلاظت کی وجہ سے جو گناہ پیدا ہوتے ہیں اُن سے بچا رہے گا۔ یہ بات طبّ کے رو سے ثابت ہوگئی ہے کہ بچہ میں پہلے گناہ غلاظت کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے۔ جب بچہ کا اندام نہانی صاف نہ ہو تو بچہ اسے کھجلاتا ہے۔ اِس سے وہ مزا محسوس کرتا اور اس طرح اُسے شہوانی قوت کا احساس ہو جاتا ہے۔ اگر بچہ کو صاف رکھا جائے اور جوں جوں وہ بڑا ہو اُسے بتایا جائے کہ ان مقامات کو صفائی کے لئے دھونا ضروری ہوتا ہے، تو وہ شہوانی بُرائیوں سے بہت حد تک محفوظ رہ سکتا ہے۔ یہ تربیت بھی پہلے دن سے شروع ہونی چاہیئے۔

(۳) غذا بچہ کو وقت مقررہ پر دینی چاہیئے۔ اس سے بچہ میں یہ عادت ہوتی ہے کہ وہ خواہشات کو دبا سکتا ہے اور اس طرح بہت سے گناہوں سے بچ سکتا ہے۔ چوری، لوٹ کھسوٹ وغیرہ بہت سی برائیاں جو اہشات کو نہ دبانے کی وجہ سے ہی پیدا ہوتی ہیں۔ کیونکہ ایسے انسان میں جذبات پر قابو رکھنے کی طاقت نہیں ہوتی۔ اور اسکی وجہ یہ ہوتی ہے کہ جب بچہ رویا ماں نے اسی وقت دودھ دے دیا۔ ایسا نہیں کرنا چاہیئے بلکہ مقررہ وقت پر دودھ دینا چاہیئے۔ اور بڑی عمر کے بچوں میں یہ عادت ڈالنی چاہیئے کہ وقت پر کھانا دیا جائے۔ اس سے یہ صفات پیدا ہوتی ہیں (۱) پابندی وقت کا احساس (۲) خواہش کو دبانا (۳) صحت (۴) مل کر کام کرنیکی عادت ہوتی ہے۔

کیونکہ ایسے بچوں میں خود غرضی اور نفسانیت نہ ہوگی۔ جبکہ وہ سب کے سب ساتھ مل کر کھانا کھائیں گے۔ (۵) اسراف کی عادت نہ ہوگی۔ جو بچہ ہر وقت کھانے کی چیزیں لیتا رہتا ہے وہ ان میں سے کچھ ضائع کریگا، کچھ کھائیگا لیکن اگر مقررہ وقت پر مقررہ مقدار میں اسے کھانے کی چیز دی جائیگی تو وہ اس میں سے کچھ ضائع نہیں کریگا۔ پس اس طرح بچہ میں تھوڑی چیز استعمال کرنے اور اسی سے خواہش کے پورا کرنے کی عادت ہوگی (٦) لالچ کا مقابلہ کرنے کی عادت ہوگی۔ مثلاً بازار میں چلتے ہوئے بچہ ایک چیز دیکھ کر کہتا ہے۔ یہ لینی ہے۔ اگر اُس وقت اُسے نہ لیکر دی جائے تو وہ اپنی خواہش کو دبالیگا۔ اور پھر بڑا ہونے پر کئی دفعہ دل میں پیدا شدہ لالچ کا مقابلہ کرنے کی اس کو عادت ہو جائے گی۔

اسی طرح گھر میں چیز پڑی ہو اور بچہ مانگے تو کہہ دینا چاہئے کہ کھانے کے وقت پر ملے گی۔ اس سے بھی اس میں یہ قوت پیدا ہو جائیگی کہ نفس کو دبا سکیگا۔

زمیندار گنے، مولی، گاجر، گُڑ وغیرہ کے متعلق اسی طرح کر سکتے ہیں۔

(۴) بچہ کو مقررہ وقت پر پاخانہ کی عادت ڈالنی چاہئے۔ یہ اسکی صحت کے لئے بھی مفید ہے۔ لیکن اس سے بڑا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ اسکے اعضاء میں وقت کی پابندی کی حِس پیدا ہو جاتی ہے۔ وقت مقررہ پر پاخانہ پھرنے سے انتڑیوں کو عادت ہو جاتی ہے اور پھر مقررہ وقت پر ہی پاخانہ آتا ہے۔ یورپ میں تو بعض لوگ حاجت سے وقت بتا دیتے ہیں۔ کہ اب یہ وقت ہوگا۔ کیونکہ مقررہ وقت پر انہیں پاخانہ کی حاجت محسوس ہوتی ہے۔ تو بچہ کے لئے یہ بہت ضروری بات ہے۔ وقت پر کام کرنے والے بچہ میں نماز، روزہ کی پختہ عادت پیدا ہو جاتی ہے اور قومی کاموں کو پیچھے ڈالنے کی عادت نہیں پیدا ہوتی۔ علاوہ ازیں بے جا جوش دب جاتے ہیں۔ کیونکہ بے جا جوش کا ایک بڑا سبب بے وقت کام کرنیکی عادت ہے خصوصاً بے وقت کھانا کھانا۔ مثلاً بچہ کھیل کود میں مشغول ہوا۔ وقت پر ماں نے کھانا کھانے کے لئے بُلایا مگر نہ آیا۔ پھر جب آیا تو ماں نے کہا ٹھہرو کھانا گرم کردوں۔ چونکہ اسے اُس وقت بھوک لگی ہوئی ہوتی ہے اس لئے وہ روتا چلاتا اور بے جا جوش ظاہر کرتا ہے، کیونکہ وہ اُسی وقت کھانے کے لئے آتا ہے جب اس سے بھوک دبائی نہیں

جاتی۔اور اس سے نہات شور کرتا ہے۔

(۵) اسی طرح غذا اندازہ کے مطابق دی جائے۔ اس سے قناعت پیدا ہوتی اور حرص دور ہوتی ہے۔

(۶) قِسم قِسم کی خوراک دی جائے، گوشت، ترکاریاں اور پھل دیئے جائیں کیونکہ غذاؤں سے بھی مختلف اقسام کے اخلاق پیدا ہوتے ہیں۔ پس مختلف اخلاق کے لئے مختلف غذاؤں کا دیا جانا ضروری ہے۔ ہاں بچپن میں گوشت کم اور ترکاریاں زیادہ ہونی چاہئیں۔ کیونکہ گوشت ہیجان پیدا کرتا ہے اور بچپن کے زمانہ میں ہیجان کم ہونا چاہیئے۔

(۷) جب بچہ ذرا بڑا ہو تو کھیل کود کے طور پر اس سے کام لینا چاہیئے۔ مثلاً یہ کہ فلاں برتن اُٹھالاؤ۔ یہ چیز وہاں رکھ آؤ۔ یہ چیز فلاں کو دے آؤ۔ اِسی قسم کے اور کام کرانے چاہئیں ہاں ایک وقت تک اسے اپنے طور پر کھیلنے کی بھی اجازت دینی چاہیئے۔

(۸) بچہ کو عادت ڈالنی چاہیئے کہ وہ اپنے نفس پر اعتبار پیدا کرے۔ مثلاً چیز سامنے ہو اور اُسے کہا جائے ابھی نہیں ملے گی۔ فلاں وقت ملیگی۔ یہ نہیں کہ چھپا دی جائے۔ کیونکہ اِس نمونہ کو دیکھ کر وہ بھی اسی طرح کریگا۔ اور اس میں چوری کی عادت پیدا ہو جائیگی۔

(۹) بچہ سے زیادہ پیار بھی نہیں کرنا چاہیئے۔ زیادہ چومنے چاٹنے کی عادت سے بہت سی بُرائیاں بچہ میں پیدا ہو جاتی ہیں۔ جس مجلس میں وہ جاتا ہے اس کی خواہش ہوتی ہے کہ لوگ پیار کریں۔ اس سے اس میں اخلاقی کمزوریاں پیدا ہو جاتی ہیں۔

(۱۰) ماں باپ کو چاہیئے کہ ایثار سے کام لیں۔ مثلاً اگر بچہ بیمار ہے اور کوئی چیز اُس نے نہیں کھانی تو وہ بھی نہ کھائیں اور نہ گھر میں لائیں بلکہ اُسے کہیں کہ تم نے نہیں کھانی اس لئے ہم بھی نہیں کھاتے۔ اس سے بچہ میں بھی ایثار کی صفت پیدا ہوگی۔

(۱۱) بیماری میں بچہ کے متعلق بہت احتیاط کرنی چاہیئے کیونکہ بُزدلی، خودغرضی، چڑچڑاہٹ جذبات پر قابو نہ ہونا اس قسم کی بُرائیاں اکثر لمبی بیماری کی وجہ سے پیدا ہو جاتی ہیں۔ کئی لوگ تو ایسے ہوتے ہیں جو دوسروں کو بُلا بُلا کر پاس بٹھاتے ہیں۔ لیکن کئی ایسے ہوتے ہیں کہ اگر کوئی اُن

کے پاس سے گذرے تو کہہ اٹھتے ہیں۔ ارے دیکھتا نہیں، اندھا ہو گیا ہے۔ یہ خرابی لمبی بیماری کی وجہ سے پیدا ہو جاتی ہے۔ چونکہ بیماری میں بیمار کو آرام پہنچانے کی کوشش کی جاتی ہے اس لئے وہ آرام پانا اپنا حق سمجھ لیتا ہے۔ اور ہر وقت آرام چاہتا ہے۔

(۱۲) بچوں کو ڈراؤنی کہانیاں نہیں سُنانی چاہئیں۔ اِس سے اُن میں بُزدلی پیدا ہو جاتی ہے اور ایسے انسان بڑے ہو کر بہادری کے کام نہیں کر سکتے۔ اگر بچہ میں بُزدلی پیدا ہو جائے تو اُسے بہادری کی کہانیاں سُنانی چاہئیں۔ اور بہادر لڑکوں کے ساتھ کھلانا چاہیئے۔

(۱۳) بچہ کو اپنے دوست خود نہ چُننے دئے جائیں بلکہ ماں باپ چنیں اور دیکھیں کہ کن بچوں کے اخلاق اعلیٰ ہیں۔ اس میں ماں باپ کو بھی یہ فائدہ ہوگا کہ وہ دیکھیں گے کِن کے بچوں کے اخلاق اعلیٰ ہیں۔ دوسرے ایک دوسرے سے تعاون شروع ہو جائیگا۔ کیونکہ جب خود ماں باپ بچہ سے کہیں گے کہ فلاں بچوں سے کھیلا کرو تو اس طرح ان بچوں کے اخلاق کی نگرانی بھی کریں گے۔

(۱۴) بچہ کو اس کی عمر کے مطابق بعض ذمہ داری کے کام دیئے جائیں تاکہ اس میں ذمہ داری کا احساس ہو۔ ایک کہانی مشہور ہے کہ ایک باپ کے دو بیٹے تھے۔ اس نے دونوں کو بُلا کر اُن میں سے ایک کو سیب دیا اور کہا کہ بانٹ کر کھا لو۔ جب وہ سیب لیکر چلنے لگا تو باپ نے کہا جانتے ہو کس طرح بانٹنا ہے۔ اُس نے کہا نہیں۔ باپ نے کہا۔ جو بانٹے وہ تھوڑا لے۔ اور دوسرے کو زیادہ دے۔ یہ سُنکر لڑکے نے کہا پھر دوسرے کو دیں کہ وہ بانٹے۔ معلوم ہوتا ہے اُس لڑکے میں پہلے ہی بُری عادت پڑ چکی تھی لیکن ساتھ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس امر کو سمجھتا تھا کہ اگر ذمہ واری مجھ پر پڑی تو مجھے دوسرے کو اپنے پر مقدم کرنا پڑیگا۔ اس عادت کے لئے بعض کھیلیں نہایت مفید ہیں جیسے کہ فٹ بال وغیرہ۔

مگر کھیل میں بھی دیکھنا چاہیے کہ کوئی بُری عادت نہ پڑے۔ عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ ماں باپ اپنے بچے کی تائید کرتے ہیں اور دوسرے کے بچہ کو اپنے بچہ کی بات ماننے کے لئے مجبور کرتے ہیں۔ اس طرح بچہ کو اپنی بات منوانے کی ضد پڑ جاتی ہے۔

(۱۵) بچہ کے دل میں یہ بات ڈالنی چاہئے کہ وہ نیک ہے اور اچھا ہے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے کیا نکتہ فرمایا ہے کہ بچہ کو گالیاں نہ دو کیونکہ گالیاں دینے پر فرشتے کہتے ہیں۔ ایسا ہی ہو جائے اور وہ ہو جاتا ہے۔

اِس کا یہ مطلب ہے کہ فرشتے اعمال کے نتائج پیدا کرتے ہیں۔ جب بچہ کو کہا جاتا ہے کہ تو بد ہے تو وہ اپنے ذہن میں یہ نقشہ جما لیتا ہے کہ مَیں بد ہوں اور پھر وہ ویسا ہی ہو جاتا ہے۔ پس بچہ کو گالیاں نہیں دینی چاہئیں بلکہ اچھے اخلاق سکھانے چاہئیں اور بچہ کی تعریف کرنی چاہیئے۔

آج صبح میری لڑکی پیسہ مانگنے آئی۔ جب مَیں نے پیسہ دیا تو بایاں ہاتھ کیا۔ مَیں نے کہا یہ تو ٹھیک نہیں۔ کہنے لگی ہاں غلطی ہے پھر نہیں کرونگی۔ اسے غلطی کا احساس کرانے سے فوراً احساس ہو گیا۔

(۱۶) بچہ میں ضِد کی عادت نہیں پیدا ہونے دینی چاہئے۔ اگر بچہ کسی بات پر ضد کرے تو اسکا علاج یہ ہے کہ کسی اور کام میں اُسے لگا دیا جائے اور ضد کی وجہ معلوم کر کے اُسے دور کیا جائے۔

(۱۷) بچہ سے ادب سے کلام کرنی چاہئے۔ بچہ نقّال ہوتا ہے۔ اگر تم اُسے تو کہہ کر مخاطب کرو گے۔ تو وہ بھی تو کہے گا۔

(۱۸) بچہ کے سامنے جھوٹ، تکبر اور ترش روئی وغیرہ نہ کرنی چاہئے۔ کیونکہ وہ بھی یہ باتیں سیکھ لیگا۔ عام طور پر ماں باپ بچہ کو جھوٹ بولنا سکھاتے ہیں۔ ماں نے بچہ کے سامنے کوئی کام کیا ہوتا ہے مگر جب باپ پوچھتا ہے تو کہہ دیتی ہے مَیں نے نہیں کیا۔ اس سے بچہ میں بھی جھوٹ بولنے کی عادت پیدا ہو جاتی ہے۔ میرا یہ مطلب نہیں کہ بچہ کی غیر موجودگی میں ماں باپ یہ کام کریں بلکہ یہ مطلب ہے کہ جو ہر وقت اِن عیبوں سے نہیں بچ سکتے وہ کم سے کم بچوں کے سامنے ایسے فعل نہ کریں۔ تا مرض آگے نسل کو بھی مبتلا نہ کرے۔

(۱۹) بچہ کو ہر قسم کے نشہ سے بچایا جائے۔ نشوں سے بچہ کے اعصاب کمزور ہو جاتے ہیں اس وجہ سے جھوٹ کی بھی عادت پیدا ہوتی ہے اور نشہ پینے والا اندھا دُھند تقلید کا عادی ہو جاتا

ہے۔ایک شخص حضرت خلیفۂ اوّل رضی اللہ عنہ کا رشتہ دار تھا وہ ایک دفعہ ایک لڑکے کو لے آیا اور کہتا تھا۔ اِسے بھی مَیں اپنے جیسا ہی بنا لونگا۔ وہ نشہ وغیرہ پیتا اور مذہب سے کوئی تعلق نہ رکھتا تھا۔ حضرت خلیفۂ اوّلؓ نے اُسے کہا تم تو خراب ہو چکے ہو اِسے کیوں خراب کرتے ہو۔مگر وہ باز نہ آیا۔ایک موقعہ پر آپ نے اُس لڑکے کو اپنے پاس بُلایا اور اُسے سمجھایا کہ تمہاری عقل کیوں ماری گئی ہے۔اس کے ساتھ پھرتے ہو۔کوئی کام سیکھو۔آپ کے سمجھانے سے وہ لڑکا اُسے چھوڑ کر چلا گیا۔مگر کچھ مدّت کے بعد وہ ایک اور لڑکا لے آیا۔اور آ کر حضرت خلیفہ اوّلؓ سے کہنے لگا۔اَب اِسے خراب کرو تو جانوں۔ اُس کے نزدیک یہی خراب کرنا تھا کہ اُس کے قبضہ سے نکال دیا جائے۔ حضرت خلیفۂ اوّلؓ نے بہتیرا اس لڑکے کو سمجھایا اور کہا کہ مجھ سے روپیہ لے لو اور کوئی کام کرو۔مگر اُس نے نہ مانا۔آخر آپ نے اُس شخص سے پوچھا اِسے تم نے کیا کیا ہے تو وہ کہنے لگا۔ اس کو مَیں نشہ پلاتا ہوں اور اس وجہ سے اس میں ہمت ہی نہیں رہی کہ میری تقلید کو چھوڑ سکے۔غرض نشہ سے اقدام کی قوت ماری جاتی ہے۔

جھوٹ سب سے خطرناک مرض ہے کیونکہ اس کے پیدا ہونے کے ذرائع نہایت باریک ہیں اِس مرض سے بچہ کو خاص طور پر بچانا چاہئے۔بعض ایسے اسباب ہیں کہ جن کی وجہ سے یہ مرض آپ ہی آپ بچہ میں پیدا ہو جاتا ہے۔مثلاً یہ کہ بچہ کا دماغ نہایت بلند پرواز واقع ہوا ہے وہ جو بات سُنتا ہے آپ ہی اُس کی ایک حقیقت بنا لیتا ہے۔ ہماری ہمشیرہ بچپن میں روز ایک لمبی خواب سُنایا کرتی تھیں۔ہم حیران ہوتے کہ روز اِسے کِس طرح خواب آ جاتی ہے۔آخر معلوم ہوا کہ سونے کے وقت جو خیال کرتی تھیں وہ اُسے خواب سمجھ لیتی تھیں۔تو بچہ جو کچھ سوچتا ہے اُسے واقعہ خیال کرنے لگتا ہے اور آہستہ آہستہ اُسے جھوٹ کی عادت پڑ جاتی ہے۔ اِس لئے بچہ کو سمجھاتے رہنا چاہئے کہ خیال اور چیز ہے اور واقعہ اور چیز ہے۔اگر خیال کی حقیقت بچہ کے اچھی طرح ذہن نشین کر دی جائے تو بچہ جھوٹ سے بچ سکتا ہے۔

(۲۰) بچوں کو علیحدہ بیٹھ کر کھیلنے سے روکنا چاہئے۔

(۲۱) ننگا ہونے سے روکنا چاہئے۔

(۲۲) بچوں کو عادت ڈالنی چاہئے کہ وہ ہمیشہ اپنی غلطی کا اقرار کریں اور اسکے طریق یہ ہیں:

(۱) اُن کے سامنے اپنے قصوروں پر پردہ نہ ڈالا جائے (۲) اگر بچہ سے غلطی ہو جائے تو اس سے اِس طرح ہمدردی کریں کہ بچہ کو یہ محسوس ہو کہ میرا کوئی سخت نقصان ہو گیا ہے جسکی وجہ سے یہ لوگ مجھ سے ہمدردی کر رہے ہیں۔ اور اُسے سمجھانا چاہئے کہ دیکھو اِس غلطی سے یہ نقصان ہو گیا ہے۔ (۳) آئندہ غلطی سے بچانے کے لئے بچہ سے اس طرح گفتگو کی جائے کہ بچہ کو محسوس ہو کہ میری غلطی کی وجہ سے ماں باپ کو تکلیف اُٹھانی پڑی ہے۔ مثلاً بچہ سے جو نقصان ہوا ہو وہ اس کے سامنے اس کی قیمت وغیرہ ادا کرے اِس سے بچہ میں یہ خیال پیدا ہو گا کہ نقصان کرینکا نتیجہ اچھا نہیں ہوتا۔ کفارہ نہایت گندہ عقیدہ ہے مگر میرے نزدیک بچہ کی اِس طرح تربیت کرنے کے لئے نہایت ضروری ہے۔ (۴) بچہ کو سرزنش الگ لیجا کر کرنی چاہئے۔

(۲۳) بچہ کو کچھ مال کا مالک بنانا چاہئے۔ اس سے بچہ میں یہ صفات پیدا ہوتی ہیں:

(۱) صدقہ دینے کی عادت۔ (۲) کفایت شعاری۔ (۳) رشتہ داروں کی امداد کرنا۔ مثلاً بچہ کے پاس تین پیسے ہوں تو اُسے کہا جائے ایک پیسہ کی کوئی چیز لاؤ اور دوسرے بچوں کے ساتھ ملکر کھاؤ۔ ایک پیسہ کا کوئی کھلونا خرید لو۔ اور ایک پیسہ صدقہ میں دے دو۔

(۲۴) اِسی طرح بچوں کا مشترکہ مال ہو۔ مثلاً کوئی کھلونا دیا جائے تو کہا جائے۔ یہ تم سب بچوں کا ہے۔ سب اس کے ساتھ کھیلو۔ اور کوئی خراب نہ کرے۔ اِس طرح قومی مال کی حفاظت پیدا ہوتی ہے۔

(۲۵) بچہ کو آداب وقواعد تہذیب سکھاتے رہنا چاہئے۔

(۲۶) بچہ کی ورزش کا بھی اور اُسے جفاکش بنانے کا بھی خیال رکھنا چاہئے۔ کیونکہ یہ بات دنیوی ترقی اور اصلاحِ نفس دونوں میں یکساں طور پر مفید ہے۔

اخلاق اور روحانیت کی جو تعریف میں اوپر بیان کر چکا ہوں اسکے مطابق وہی بچہ تربیت یافتہ کہلائیگا جس میں مندرجہ ذیل باتیں ہوں: (۱) ذاتی طور پر بااخلاق ہو اور اسمیں روحانیت ہو (۲) دوسروں کی ایسا بنانے کی قابلیت رکھتا ہو۔ (۳) قانون، سلسلہ کے مطابق چلنے کی قابلیت

رکھتا ہو۔(۴) اللہ تعالیٰ سے خاص محبت رکھتا ہو جو سب محبتوں پر غالب ہو۔

پہلے امر کا معیار یہ ہے کہ (۱) جب بچہ بڑا ہو تو امورِ شرعیہ کی لفظاً و عملاً وعقیدۃً پابندی کرے۔(۲) اس کی قوت ارادی مضبوط ہو تا آئندہ فتنہ میں نہ پڑے (۳) اس کا اپنی ضروریات زندگی کا خیال رکھنا اور جان بچانے کی قابلیت رکھنا۔ (۴) اپنے اموال و جائیداد بچانے کی قابلیت کا ہونا اور اسکے لئے کوشش کرنا۔

دوسرے امر کا معیار یہ ہے: (۱) اخلاق کا اچھا نمونہ پیش کرے۔(۲) دوسروں کی تربیت اور تبلیغ میں حصہ لے۔ (۳) اپنے ذرائع کو ضائع ہونے نہ دے بلکہ انہیں اچھی طرح استعمال کرے جس سے جماعت و دین کو زیادہ سے زیادہ فائدہ پہنچے۔

تیسرے امر یعنی قانونِ سلسلہ کے مطابق چلنے کی طاقت رکھنے کا یہ معیار ہے: (۱) اپنی صحت کا خیال رکھنے والا ہو۔(۲) جماعتی اموال اور حقوق کا محافظ ہو۔(۳) کوئی ایسا کام نہ کرے جس سے دوسروں کے حقوق کو نقصان پہنچے۔(۴) قومی جزا اور سزا کو برداشت کرنے کے لئے تیار ہو۔

چوتھے امر کا معیار یہ ہے: (۱) کلام الٰہی کا شوق اور ادب ہو (۲) خدا تعالیٰ کا نام اُسے ہر حالت میں مؤدّب اور ساکن بنا دے۔(۲) دنیا میں رہتے ہوئے دنیا سے بکلی الگ ہو۔(۴) خدا کی محبت کی علامات اس کے وجود میں پائی جائیں۔

اب بچہ کی تربیت کرنے کے بعد یہ سوال باقی رہ جاتا ہے کہ جن میں گناہ پیدا ہو گیا اُن سے کس طرح دور کرایا جائے؟ یہ کل بیان کروں گا۔

خطاب حضرت خلیفۃ المسیح الثانی رضی اللہ عنہ

فرمودہ ۲۸؍دسمبر ۱۹۲۵ء بر موقعہ جلسہ سالانہ

چونکہ مجھے کھانسی کی تکلیف تھی اسوجہ سے کل کی تقریر اور آج کی تقریر کرنے سے جو عورتوں میں کی گئی میرا گلا بیٹھ گیا ہے لیکن احباب گھبرائیں نہیں۔ اللہ تعالیٰ چاہے تو اُن تک آواز پہنچ جائیگی۔

مَیں اصل تقریر شروع کرنے سے پہلے دوستوں کو یہ نصیحت کرنا چاہتا ہوں کہ وہ ذکر الٰہی کی عظمت کو اچھی طرح سمجھیں۔ یہاں وہ کسی تماشہ اور کھیل کے لئے جمع نہیں ہوتے بلکہ اللہ تعالیٰ کا ذکر کرنے اور اس کا نام لینے کے لئے آتے ہیں۔ اس لئے ذکر الٰہی کے آداب کو مدنظر رکھنا چاہئے۔ لیکن مجھے افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ بعض دوست اس ادب کو مدنظر نہیں رکھتے اور بلا وجہ اور بلا سبب جلسہ گاہ سے اُٹھ کر باہر چلے جاتے اور ادھر اُدھر باتیں کرتے رہتے ہیں۔ مَیں جانتا ہوں کہ جلسہ پر ایک کافی تعداد جو آٹھ سو اور ہزار کے قریب قریب ہوتی ہے غیر احمدیوں کی ہوتی ہے اور وہ لوگ اپنے نفس پر جبر کر کے وعظ سُننے کے عادی نہیں ہوتے اور ان کا کثیر حصہ جلسہ گاہ میں آتا اور جاتا رہتا ہے۔ مگر تجربہ بتاتا ہے کہ وہی لوگ آنے جانے والے نہیں ہوتے بلکہ بعض احمدی بھی اس جلسہ گاہ سے باہر چلے جاتے ہیں۔ کہ چلو ان کو باہر جا کر تبلیغ کریں۔ مگر یاد رکھنا چاہئے مذہب میں انسان پر سب سے بڑا فرض اپنی جان کا ہوتا ہے۔ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا۔ کہ جس وقت اپنی ہدایت کی فکر میں ہو۔ اگر کوئی دوسرا گمراہی میں پڑتا ہے تو پڑنے دو۔ اپنی ہدایت کی فکر دوسرے کی خاطر چھوڑ نہ دو۔ دین کے لئے مال قربان کیا جاتا ہے۔ اور جان قربان کی جاتی ہے مگر دین وہ چیز ہے کہ ساری دنیا کی خاطر بھی قربان کرنے کے لئے کوئی مومن تیار نہیں ہوسکتا۔ پس اگر کسی مجبوری کی وجہ سے جلسہ گاہ سے اُٹھنا پڑے اور بعض دفعہ ایسی مجبوریاں پیش آجاتی ہیں جیسے قضائے حاجت کے لئے جانا تو

بے شک جاؤ۔ مگر فارغ ہو کر جلدی واپس آ جانا چاہیئے کیونکہ کیا معلوم ہے کہ کب وہ گھڑی آ جائے جس کے لئے انسان ساری عمر کوشش کرتا رہتا ہے۔ ایک گھڑی ایسی آ سکتی ہے کہ اُسوقت ایک کلمہ انسان کو کافر سے مومن بنا دیتا ہے۔ اُسے شیطانی سے رحمانی بنا دیتا ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا واقعہ ہی دیکھ لو۔ آپ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی مخالفت میں انتہا کو پہنچے ہوئے تھے مگر ایک بات انکے کان میں ایسی پڑ گئی جس نے اُن کی حالت بالکل بدل دی۔ وہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے قتل کے لئے نکلے کہ انہیں معلوم ہوا اُن کی اپنی بہن مسلمان ہو چکی ہے۔ اِسپر اپنی بہن کے ہاں گئے اور گھر میں قرآن کریم پڑھتے ہوئے سُنا۔ غصّہ میں آ کر اندر گھس گئے اور اپنے بہنوئی کو مارنے لگے۔ اسپر بہن بچانے لگی تو اس کے بھی چوٹ آئی۔ اِس حالت کو دیکھ کر اُن کے دل میں کچھ ندامت پیدا ہوئی تھی کہ بہن نے کہا کہ عمر! تم ہم پر اسلئے ناراض ہوتے ہو کہ ہم نے ایک خدا کو مانا ہے یہ سُن کر وہ سر سے پاؤں تک کانپ گئے اور اپنی بہن سے کہا۔ جو تم بڑھ رہے تھے وہ مجھے بھی سناؤ۔ اُنکی بہن نے کہا۔ پاک ہو کر آؤ تو سُنائیں۔ وہ نہا کر آئے اور اُن کے سامنے قرآن کریم کی تلاوت کی گئی۔ جسے سُنکر اُن کے آنسو رواں ہو گئے اور سیدھے رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے پاس آئے۔ آ کر دستک دی جب معلوم ہوا کہ عمر ہیں تو بعض نے کہا دروازہ نہیں کھولنا چاہیئے وہ سخت آدمی ہیں۔ نقصان نہ پہنچائیں۔ حضرت حمزہؓ نے کہا کہ اگر مخالفت کی نیت سے آئے ہیں تو ہمارے پاس بھی تلوار ہے۔ آخر رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے اندر آنے کی اجازت دے دی۔ جب سامنے آئے تو رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا۔ عمرؓ! کب تک مخالفت کرتے رہو گے۔ اس پر انہوں نے کہا مَیں تو غلامی کے لئے آیا ہوں۔ اب دیکھو انہیں کس طرح ہدایت نصیب ہوئی؟ اگر وہ اس مجلس میں نہ جاتے تو شاید عمرؓ ایمان سے محروم رہتے۔ آپ لوگوں کے لئے سارا سال آرام کرنے کے لئے پڑا ہے۔ اس لئے یہ چند دن کی تکلیف اُٹھا کر بھی خدا تعالیٰ کا کلام سُننا چاہیئے اور کوئی لمحہ ضائع نہیں کرنا چاہیئے۔

دوسری بات مَیں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ جیسا کہ مَیں نے کل بتایا تھا میں نے قرآن کریم کے ترجمہ کا کام شروع کیا ہوا ہے اور خدا کے فضل سے ۲۰ ؍دسمبر کو سورۂ بقرہ کا ترجمہ ختم ہو گیا ہے۔ اور

اُمید ہے کہ اگلے سال ساڑھے سات پاروں کی پہلی جلد شائع ہو جائیگی۔ مَیں چاہتا ہوں کہ احباب دُعا کریں۔ بغیر اس کے کہ اس کام میں کوئی روک پیدا ہومَیں اس کام کو سرانجام دے کر اس فرض سے سُبک دوش ہو جاؤں اور تفسیر اور ترجمہ دوستوں تک پہنچا سکوں۔

تیسری بات مَیں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ کل مَیں نے مالی مشکلات کی طرف جماعت کو توجہ دلائی تھی آج مَیں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ ان مشکلات سے گھبرانا نہیں چاہئے کیونکہ یہ بھی سلسلہ کی سچائی کی ایک علامت ہے۔ ایک فرانسیسی مصنف لکھتا ہے مَیں نے بیسیوں کتابیں پڑھی ہیں جن میں لکھا ہے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) جھوٹا ہے مگر مَیں اُن کتابوں کو کیا کروں جب کہ مَیں دیکھتا ہوں کہ محمد (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) ان لوگوں میں جو غریب، وحشی اور غیر تعلیم یافتہ ہیں ایک کچے مکان میں بیٹھا ہوا جو چھوٹا سا کمرہ ہے اور مسجد کے نام سے مشہور ہے۔ اور جس کی چھت پر کھجور کی ٹہنیاں بغیر صاف کیئے پڑی ہیں اور جب بارش ہوتی ہے تو اِتنا پانی ٹپکتا ہے کہ سجدہ پانی میں کرنا پڑتا ہے ایسے لوگوں میں جن میں سے کسی کے پاس بھی سارا تن ڈھانکنے کے لئے کپڑا نہیں۔ یہ مشورہ کر رہا ہے کہ ساری دُنیا کو کس طرح فتح کرنا چاہئے اور پھر ایسا کر کے بھی دکھا دیتا ہے۔ وہ مصنف کہتا ہے لاکھوں صفحوں کے مقابلہ میں جب مَیں اس واقعہ کو دیکھتا ہوں تو سب باتیں حقیر معلوم ہوتی ہیں۔

اِسی طرح جب حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے دعویٰ کیا تھا اُسی وقت اُمراء اور بادشاہ آپ کے ساتھ شامل ہو جاتے تو کیونکر ثابت ہوتا کہ آپ کو جو کامیابی حاصل ہوئی وہ خدا کا فعل تھا۔ وہ تو امراء اور بادشاہوں کا فعل سمجھا جاتا۔ مگر جب آپ نے دعویٰ کیا تو سب بھائی بند اور عزیز رشتہ دار آپ کے دشمن ہو گئے۔ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کا سب سے بڑا دوست اور آپ کے علم اور معرفت کا سب سے بڑا معترف مولوی محمد حسین بٹالوی تھا۔ اس نے اعلان کر دیا کہ آپ کا دماغ بگڑ گیا ہے۔ مَیں نے اسے بڑھایا تھا، مَیں ہی اِسے گراؤں گا۔ ساری دنیا کے علماء نے آپ کا مقابلہ کیا۔ عرب اور عجم سے آپ کے خلاف فتوے منگائے گئے مگر باوجود دُنیا کی اسقدر مخالفت کے آپ اکیلے اُٹھے اور کہا یہ ٹھیک ہے کہ میرے ساتھ کوئی آدمی نہیں اور ساری دُنیا

میری دشمن بن گئی ہے۔ مگر مَیں اس آواز کو کیا کروں جو مجھے خدا تعالیٰ کی طرف سے سُنائی دے رہی ہے کہ ''دُنیا میں ایک نذیر آیا پر دُنیا نے اُسے قبول نہ کیا لیکن خدا اُسے قبول کریگا اور بڑے زور آور حملوں سے اُس کی سچائی ظاہر کر دیگا'' مَیں اس آواز کا کس طرح انکار کر دوں۔ اسوقت گورنمنٹ بھی آپ کی مخالف تھی اور تمام لوگ بھی دشمن تھے مگر نتیجہ کیا نکلا؟ وہ ایک طرف تھا اور ساری دنیا دوسری طرف مگر یہ اتنے لوگ اس کے شکار پکڑے ہوئے یہاں بیٹھے ہیں اور یہ تو اس جگہ کا نظارہ ہے باہر لاکھوں کی تعداد میں موجود ہیں۔

مَیں پچھلے سال جب شام گیا تو دمشق کے ایک بڑے ادیب نے جو ادب کے مجدد مانے جاتے ہیں مجھے تمسخر سے کہا۔ آپ مرزا صاحب کی کتابوں کی یہاں اشاعت نہ کریں۔ کیونکہ ان میں غلطیاں ہیں اور لوگ ان غلطیوں کو دیکھ کر اُن سے بدظن ہو جائیں گے۔ مَیں نے کہا لو مَیں یہاں بیٹھا ہوں اور اسوقت تک یہاں سے نہیں جاؤنگا جبتک تمہارے اس دعویٰ کو باطل نہ کرلوں۔ تم حضرت مسیح موعودؑ کی کتابوں پر جو اعتراض کرنا چاہتے ہو کرلو۔ یہ سُنکر وہ کہنے لگا میں تو آپ کا خیر خواہ ہوں مَیں آپ کا مقابلہ کرنا نہیں چاہتا۔ مَیں نے کہا ضرور کرو اگر کر سکتے ہو۔ کہنے لگا۔ اس میں آپ کا نقصان ہوگا۔ مَیں نے کہا اگر ہم جھوٹے ہیں تو تمہارا فرض ہے کہ مقابلہ کرو اور اگر ہم سچے ہیں تو تمہارے مقابلہ سے ہمیں نقصان نہیں پہنچے گا۔ بلکہ فائدہ ہوگا۔ مگر اُس نے کوئی اعتراض نہ کیا۔ پھر کہنے لگا۔ عرب ایک ہندوستانی کو مسیح موعودؑ نہیں مان سکتے۔ مَیں نے کہا مَیں یہاں مشن قائم کرنے والا ہوں۔ ہم یہاں جماعت قائم کریں گے تم زور لگا لو۔ خدا کی قدرت ہم وہاں پانچ دن کے لئے ہی گئے تھے۔ جب چلنے لگے تو ایک عالم کا جو عربی، فارسی، ٹرکی کا ماہر تھا رات کے دس بجے کے قریب رقعہ آیا کہ مَیں ملاقات کی خاطر صبح سے بیٹھا ہوں۔ ممکن ہے اب بھی مجھے ملاقات کے لئے وقت نہ ملے۔ اس لئے مَیں اس رقعہ کے ذریعہ اطلاع دیتا ہوں کہ مَیں مرزا صاحب پر ایمان لے آیا۔ اب آپ جہاں چاہیں مجھے تبلیغ کے لئے بھیج دیں۔ اور اب تو وہاں ہمارا وفد پہنچ گیا ہے اور اس کے ذریعہ جماعت قائم ہوگئی ہے اور اُسی شخص نے جس نے کہا تھا کہ یہاں کوئی شخص نہیں مان سکتا کہلا بھیجا ہے کہ مجھ پر بدظنی نہ کی جائے مَیں کبھی آپ کی مخالفت نہیں

کرونگا۔

پس آپ لوگ اپنی غربت اور کمزوری کا خیال نہ کریں۔ وہ شخص جو یہ سمجھتا ہے کہ ہم اپنی غُربت اور کمزوری کی وجہ سے کامیاب نہ ہونگے وہ مشرک ہے کیونکہ وہ سمجھتا ہے کہ سلسلہ کا کام اُس نے کرنا ہے پھر جو شخص اپنے آپ کو ناکارہ سمجھتا ہے وہ خدا تعالیٰ پر الزام لگاتا ہے کہ اس علیم ہستی نے دنیا کو فتح کرنے کے لئے یہ ناکارہ ہتھیار چُنا۔ اسے کون اچھا سپاہی کہیگا جو ٹوٹی ہوئی بندوق یا تلوار اُٹھا کر دشمن کے مقابلہ میں نکلتا ہے۔ پھر جس کو خدا تعالیٰ نے سلسلہ کی خدمت کے لئے چُنا وہ ناکارہ کس طرح ہوسکتا ہے۔ وہ کام کا انسان ہے۔ اور جسے خدا تعالیٰ چُنتا ہے وہ ذلیل نہیں ہوتا بلکہ وہی معزز ہے۔

مدینہ کے ایک رئیس نے آج سے تیرہ سو سال پہلے کہا تھا کہ مدینہ کا سب سے معزز وہاں کے سب سے ذلیل شخص (رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نعوذ باللہ من ذالک) کو مدینہ سے نکال دیگا۔ اللہ تعالیٰ اس کا ذکر کرتے ہوئے فرماتا ہے۔ وہ کہتا ہے عزت اس کے پاس ہے عزت تو رسول کو ماننے میں ہوتی ہے۔ اس کے الفاظ کا نتیجہ یہ ہوا کہ اُس کا بیٹا رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور آکر کہنے لگا مَیں نے سُنا ہے میرے باپ نے اس اس طرح کہا ہے اسکی سزا یہ ہے کہ اُسے قتل کیا جائے۔ مگر یہ نہ ہو کہ کوئی اور قتل کرے۔ کسی وقت شیطان مجھے دھوکہ دے کر اس کے خلاف بھڑکائے۔ اس لئے اُس کے قتل کی خدمت میرے سپرد کی جائے۔ یہ بات سُنکر اُسے اپنی عزّت کا اچھی طرح احساس ہوگیا ہوگا۔

آپ لوگ اپنے ذرائع، علم، حیثیت کی کمی پر نگاہ نہ رکھیں۔ یہ موجودہ جماعت جن ذرائع سے بنی ہے وہ اسوقت کے ذرائع سے بہت کم تھے اور جب لوگ کئی لاکھ کو کھینچ کر سلسلہ میں لے آئے ہیں تو یہ کئی لاکھ کئی کروڑ کیوں نہ لائیں گے۔ تھوڑے ہی دن ہوئے مَیں نے ایک رؤیا دیکھی کہ مَیں خطبہ پڑھ رہا ہوں۔ جس میں کہتا ہوں ہمیں اپنے بچوں کی صحت کا خاص خیال رکھنا چاہیئے کیونکہ اس وقت جو بوجھ ہمارے کندھوں پر ہے اس سے ہزار گنا زیادہ بوجھ ان کے کندھوں پر ہوگا۔ پس ہماری آئندہ پیدا ہونے والی نسلیں دیکھینگی کہ دنیا کی زبردست طاقتیں اور قوتیں یہ

تسلیم کرنے پر مجبور ہو جائیں گی کہ اب احمدیت کو کوئی مٹا نہیں سکتا۔ مگر خدا تعالیٰ اسی پر راضی نہ ہوگا۔ وہ جماعت کو اور بڑھاتا جائیگا جب تک لوگ یہ نہ کہہ اُٹھیں کہ دُنیا میں احمدیت ہی ایک مذہب ہے۔ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اِس زمانہ میں جبکہ آپ کے ساتھ ایک بھی آدمی نہ تھا فرمایا تھا کہ خدا تعالیٰ نے مجھے خبر دی ہے کہ تمہاری جماعت اسقدر ترقی کریگی کہ باقی اقوام دنیا کی اس طرح رہ جائینگی جس طرح آجکل پُرانی خانہ بدوش قومیں ہیں۔ پس کچھ لوگ آج مانیں گے، کچھ کل، کچھ پرسوں۔ اسی طرح روز بروز اور دن بدن جماعت بڑھتی جائیگی اور ساعت بساعت اسکی قوت ترقی کرتی جائیگی۔ غریب امیر، عام انسان وخواص و بادشاہ اور رعایا حضرت مسیح موعودؑ پر ایمان لائیگی۔ یہاں تک کہ ساری دنیا میں یہی سلسلہ رہ جائیگا اور باقی مذاہب اس کے مقابلہ میں اسی طرح ماند ہو جائینگے جس طرح سورج کے سامنے ستارے ماند پڑ جاتے ہیں۔

یہ خدا تعالیٰ کی فرمائی ہوئی باتیں ہیں جو پوری ہوکر رہیں گی۔ پس دنیا کی بڑی سے بڑی روکیں ہمارے ایمانوں کو متزلزل نہیں کرسکتیں اور ہم لوگوں کی مخالفت سے مایوس نہیں ہوسکتے جس شخص نے یہ دیکھا ہو کہ ایک اکیلے انسان کے ذریعہ لاکھوں انسانوں کی جماعت بن گئی ہے وہ آئندہ ترقی سے کیونکر ناامید ہوسکتا ہے۔ ہم ایسے بے ایمان نہیں ہیں کہ لاکھوں نشانات دیکھ کر اور خدا تعالیٰ کے بیشمار وعدے پورے ہوتے دیکھ کر یہ خیال کریں کہ ہم دنیا کو فتح نہیں کرسکیں گے بے شک ہم کمزور ہیں۔ ہمارے پاس ظاہری سامان نہیں۔ ہم میں طاقت نہیں لیکن دنیا کو ہم نے فتح نہیں کرنا بلکہ خدا تعالیٰ نے کرنا ہے اور اس کو سب طاقتیں حاصل ہیں۔ پس ہمیں مشکلات اور رکاوٹوں سے گھبرانا نہیں چاہیئے بلکہ خدا تعالیٰ کے وعدوں کے پورا ہونے پر پورا پورا وثوق ہونا چاہیئے۔

اَب مَیں اصل مضمون کی طرف آتا ہوں۔ کل یہاں تک مضمون پہنچا تھا کہ انسان کو پاکیزگی، نفس اور طہارت قلب کس طرح میسر ہوسکتی ہے اور کونسے ذرائع ہیں کہ انسان بلوغت کو پہنچ کر گناہ کو اپنے سے دور رکھے اور نیکی حاصل کرسکے۔

اس سوال کا جواب یہ ہے کہ دُنیا میں انسان کی طبائع مختلف قسم کی ہیں۔ کوئی ادنیٰ ہے اور کوئی اعلیٰ۔ اسوجہ سے تمام فطرتوں کے لئے ایک قانون جاری نہیں ہوسکتا اور نہ ایک قسم کا علاج سب کے لئے مفید ہوسکتا ہے۔ دنیا میں ہی دیکھا جائے تو ایک ہی بیماری کا سب کے لئے ایک علاج مفید نہیں ہوسکتا۔ مَیں نے دیکھا ہے نزلہ ہوتا ہے تو ایک بیمار ایسا ہوتا ہے کہ اگر وہ قہوہ پی لے تو دو گھنٹہ میں اس کا نزلہ ہٹ جاتا ہے۔ اور کوئی دہی میں میٹھا ملا کر پی لے تو اسی سے اس کا نزلہ جاتا رہتا ہے۔ مگر کئی انسان ایسے ہوتے ہیں کہ کئی دن میں علاج کرانے کے بعد اچھے ہوتے ہیں کئی ایسے ہوتے ہیں کہ حکیموں سے مشورہ لینے کی انہیں ضرورت پڑتی ہے۔ اور کئی ایسے بھی ہوتے ہیں کہ ان کی بیماری کے متعلق ڈاکٹروں کی عقلیں چکر میں آجاتی ہیں۔ اسکی کیا وجہ ہے؟ یہی کہ مختلف لوگوں کو مختلف قسم کی بیماریاں ہوتی ہیں اور ان کو مختلف قسم کے علاج سے افاقہ ہوتا ہے۔ یہی حال دیگر اُمور میں بھی ہے اور چونکہ انسانی قوتوں کے تفاوت کا انکار کرنا ناممکن ہے۔ اس لئے ضروری ہے کہ علاج کے وقت لوگوں کے تفاوت اور استعدادوں کے اختلاف کو مدنظر رکھیں۔ اسی بات کو پیش نظر رکھتے ہوئے مَیں گناہوں سے بچنے کا طریق بھی بیان کرتا ہوں۔ سب سے پہلے مَیں اس فطرت کو لیتا ہوں جو زنگ سے بالکل پاک ہوتی ہے اور جس میں طاقت ہوتی ہے کہ عقل سے کام لے سکے اور اعمال کو جاری رکھ سکے۔

سب سے پہلے یہ بات یاد رکھنی چاہئے کہ اسلام میں پاکیزگی اس کا نام نہیں کہ زبان پر اچھی باتیں ہوں یا اعمال اچھے ہوں۔ بلکہ اسلام میں اصل دل کی پاکیزگی ہے۔ جو انسان دل کا پاک نہیں وہ خدا تعالیٰ کے نزدیک پاک نہیں ہے۔ ایک شخص قطعاً کوئی گناہ نہ کرے مگر اس کے دل میں گناہ اور بُرائی سے اُلفت ہو اور گناہ کے ذکر میں اُسے لذّت محسوس ہو تو وہ نیک اور پاک نہیں کہلا سکیگا جبتک اس کے دل میں بھی یہ بات نہ ہو کہ گناہ میں ملوث نہ ہو۔ اِسی طرح کئی لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ عادت کے ماتحت انہیں غصہ آتا ہے مگر گالی نہیں دیتے لیکن ان کا دل کہہ رہا ہوتا ہے کہ فلاں انسان بڑا بدمعاش اور شریر ہے۔ ایسے لوگوں کے متعلق ہم یہ نہ کہیں گے کہ وہ پاکیزہ ہیں۔ بلکہ یہ کہیں گے کہ وہ اپنے گند کو چھپائے بیٹھے ہیں۔ پس اسلام میں پاکیزگی دل کی ہے۔

اعمال اور زبان تو آلات اور ذرائع ہیں جن سے پاکیزگی ظاہر ہوتی ہے۔ قرآن شریف میں خدا تعالیٰ فرماتا ہے: وَاِنْ تُبْدُوْا مَا فِیْٓ اَنْفُسِکُمْ اَوْ تُخْفُوْہُ یُحَاسِبْکُمْ بِہِ اللّٰہ (۲:۲۸۵) کہ جو دل کی حالت ہو وہ محاسبہ کے نیچے آتی ہے خواہ تم دل کی حالت کو چھپاؤ یا ظاہر کرو۔ یہاں خدا تعالیٰ نے کیا عجیب نکتہ بیان فرمادیا کہ زبان اور اعمال تو دلی حالت کا اظہار کرتے ہیں۔ اصل چیز دلی حالت ہے۔ خدا تعالیٰ اسی کا محاسبہ کریگا۔ فرماتا ہے تم دلی حالت کو ظاہر کرو یا چھپاؤ۔ یعنی تم اعمال گندے نہ کرو یا زبان سے ظاہر نہ کرو مگر تمہارے دل میں گند ہے تو ضرور پکڑے جاؤ گے دوسری جگہ خدا تعالیٰ فرماتا ہے: فَاتَّقُوا اللّٰہَ مَا اسْتَطَعْتُمْ وَاسْمَعُوْا وَاَطِیْعُوْا وَاَنْفِقُوْا خَیْرًا لِّاَنْفُسِکُمْ وَمَنْ یُّوقَ شُحَّ نَفْسِہٖ فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْمُفْلِحُوْنَ. (۶۴:۱۷) کہ سب اعمال بجا لاؤ۔ مگر نفس کو پاک کرو۔ کیونکہ جس کے قلب میں بُرائی ہوگی وہ پکڑا جائیگا۔

یہ بات سمجھانے کے بعد کہ اصل نیکی دل کی پاکیزگی ہے اَب میں یہ بتاتا ہوں کہ جس فطرت پر زنگ نہ ہو اس کے لئے گناہوں سے بچنے کے تین علاج ہیں (۱) یہ کہ اُسے بدیوں کا علم اور نیکیوں کی خبر ہو۔ خواہ دل ایک شخص کو کہتا ہو کہ نیکی کرو۔ لیکن اگر نیکی کا پتہ ہی نہ ہو تو کیا کرے گا۔ اِسی طرح دل خواہ اُسے بُرائی سے باز رہنے کی تحریک کرتا ہو لیکن اُسے یہ علم ہی نہ ہو کہ فلاں فعل کا ارتکاب بُرائی ہے تو اس سے کس طرح بچ سکے گا۔ پس ضروری ہے کہ انسان کو معلوم ہو کہ اُسے کیا کرنا ہے اور کیا نہیں کرنا۔ خالی کسی فعل کے کرنے یا کسی فعل کے ارتکاب سے باز رہنے کی استعداد کافی نہیں ہوتی۔ مثلاً کسی شخص کی خواہش ہو کہ وہ اپنے دوست کو خوش کرے۔ مگر وہ دوست بتاتا نہیں کہ کِس طرح خوش ہوسکتا ہے تو وہ کیا کرسکتا ہے۔ پس سب سے پہلے یہ ضروری ہے کہ بدیوں کا علم اور نیکیوں کی خبر ہو۔

(۲) اسے معلوم ہو کہ بدیوں سے اجتناب اور نیکیوں پر عمل کرنے کے مواقع کیا کیا ہیں۔ یہ ایسی بات ہے کہ نوکر کو کہیں فلاں اسباب اُٹھا کر اندر رکھ دو۔ نوکر رکھنے کے لئے مستعد ہو۔ اور ہم نے اُسے کہہ دیا کہ رکھ دو۔ لیکن اگر اُسے یہ پتہ نہیں کہ کہاں کہاں رکھنا ہے تو وہ میز کی جگہ کُرسی اور کُرسی کی جگہ میز رکھ دیگا۔ یہی حال اس شخص کا ہوسکتا ہے جسے نیکیوں کے کرنے اور بدیوں سے

بچنے کے مواقع کا علم نہ ہو۔ پس مواقع کا معلوم ہونا بھی ضروری ہے۔

(۳) یہ معلوم ہو کہ کونسی بدیاں میرے اندر ہیں جنہیں مَیں نے دور کرنا ہے۔ جب تک اس بات کا علم نہ ہو وہ اپنا علاج کس طرح کرا سکتا ہے۔ پس روحانی علاج کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ معلوم ہو کہ میرے اندر کیا کیا بدیاں ہیں۔ اور کون کون سی نیکی کی کمی ہے تا کہ بدیوں سے بچوں۔ اور نیکیاں حاصل کرنے کی کوشش کروں۔ اگر ایک شخص کے قلب میں زنگ اور تاریکی اور روکاوٹ نہیں ہے تو اوپر کی باتیں معلوم ہونے پر وہ نیک ہو جائیگا جب تک اپنی کمزوریوں کا علم نہ ہو۔ کوئی انسان علاج نہیں کر سکتا۔ اور اگر معلوم ہو جائیں تو نہایت آسانی سے علاج کر سکتا ہے۔

اَب میں ان تینوں باتوں کی موٹی موٹی تشریح بیان کرتا ہوں۔ اوّل میں بدیوں اور نیکیوں کے علم کو لیتا ہوں۔ مَیں نے دیکھا ہے بہت لوگ ایسے موجود ہیں کہ اُن میں استعداد ہے کہ نیک ہو جائیں مگر انہیں بدیوں اور نیکیوں کا پتہ نہیں ہوتا۔ کئی لوگ مردوں میں سے بھی اور عورتوں میں سے بھی کہتے ہیں۔ کیا ہم میں (۱) فسق و فجور ہے۔ (۲) ظلم ہے۔ (۳) ہم لوگوں کا مال کھا جاتے ہیں۔ (۴) جھوٹ بولتے ہیں۔ (۵) زنا کرتے ہیں۔ اگر نہیں تو پھر ہم میں کونسی بُرائی ہے۔ گویا جن میں یہ باتیں نہ ہوں وہ سمجھتے ہیں ان میں کوئی عیب نہیں ہے اور لوگ یہ پانچ عیب شرعی قرار دیا کرتے ہیں گویا اس سے زیادہ عیب نہیں۔ حالانکہ یہ لمبا سلسلہ چلتا ہے اور عیب سینکڑوں تک پہنچتے ہیں۔ اس وقت اِن سب کا بیان کرنا مشکل ہے۔ وقت کے لحاظ سے بھی اور یوں بھی کہ بعض عیب انسان کے علم سے اوپر ہوتے ہیں اور ایسا انسان جسے سب عیوب کا علم تھا وہ محمد صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم ہی کی ذات تھی اور انسانوں کو بھی عیوب کی اطلاع دی جاتی ہے مگر اسقدر علم کسی انسان کو نہ ہوا ہے نہ ہو سکتا ہے جسقدر رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو تھا۔

ایک دفعہ مَیں نے رؤیاء میں دیکھا کہ مَیں دوست کو سمجھا رہا ہوں کہ ورزش نہ کرنا بھی گناہ ہے مگر یوں ہم اسے گناہ نہیں کہتے۔ لیکن ایک انسان جسکی زندگی پر لاکھوں انسانوں کی زندگی کا مدار ہو۔ اگر وہ اپنی زندگی کی حفاظت نہیں کرتا تو وہ گناہ کرتا ہے۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے بڑھ کر کون بہادر ہو سکتا ہے مگر جنگ میں آپکی حفاظت کے لئے پہرہ ہوتا تھا اور آپ کے گھر

پر بھی پہرہ ہوتا تھا۔کوئی کہے وہ اپنی جان کی حفاظت دوسروں سے مقدم سمجھتے تھے۔مگر ایسا کرنا ضروری تھا۔ کیونکہ آپ کی حیات سے دنیا کی زندگی وابستہ تھی۔ اگر آپ نہ ہوتے تو دنیا میں اسلام کس طرح قائم ہوتا؟ تو بعض انسانوں کا آرام اور صحت کا قائم رکھنا نیکی ہوتی ہے۔اس کے خلاف کرنا گناہ ہوتا ہے۔شیخ عبدالقادر صاحبؒ جیلانی ایک کتاب میں فرماتے ہیں کہ مجھ پر ایسی حالت آتی ہے کہ جبتک خدا مجھے نہیں کہتا کہ عبدالقادر اُٹھ تجھے میری جان کی قسم کھانا کھالے تو مَیں کھانا نہیں کھاتا۔اور جبتک وہ نہیں کہتا کہ میری جان کی قسم کپڑا پہن تو میں نہیں پہنتا۔اس کا یہی مطلب ہے کہ اس مرتبہ کے انسان کو خدا کہتا ہے کہ اپنی خاطر نہیں میرے لئے یہ کام کر تو وہ کرتا ہے۔ کیونکہ وہ سب کچھ خدا کے لئے کر رہا ہوتا ہے۔پس گناہوں کے اسقدر مدارج ہیں کہ انسان کی حالت کے ساتھ ساتھ انکی کیفیت بھی بدلتی رہتی ہے۔اسی لئے صوفیا، کہتے ہیں کہ ابرار کے گناہ عوام کی نیکیاں ہوتی ہیں۔

اَب میں موٹی موٹی تشریح بدیوں کی کرتا ہوں۔اوّل وہ بدیاں جو ذاتی ہوتی ہیں۔یعنی جن کا اثر انسان کے اپنے نفس پر پڑتا ہے۔

(۲) وہ بدیاں جو دوسروں سے تعلق رکھتی ہیں۔یعنی اُن کا اثر انسان کے اپنے نفس پر ہی نہیں پڑتا بلکہ دوسروں پر بھی اُن کا اثر ہوتا ہے۔

(۳) وہ بدیاں جو قومی ہوتی ہیں۔یعنی قوم کی حیثیت کو مدنظر رکھتے ہوئے وہ بدی ہوتی ہے۔

(۴) وہ بدیاں جو خدا تعالیٰ سے تعلق رکھتی ہیں۔

اس کے مقابلہ میں نیکیوں کی بھی چار قسمیں ہیں (۱) ذاتی نیکیاں یعنی جن کا اثر انسان کی اپنی ذات پر پڑتا ہے۔

(۲) وہ نیکیاں جو دوسروں سے بھی تعلق رکھتی ہی۔یعنی جن کا اثر دوسروں پر بھی پڑتا ہے۔

(۳) قومی نیکیاں جو بحیثیت قوم نیکیاں سمجھی جاتی ہیں۔

(۴) وہ نیکیاں جو خدا تعالیٰ سے تعلق رکھتی ہیں۔

اَب مَیں اُن بدیوں کو بیان کرتا ہوں جو ذاتی بدیاں ہیں اور ان کی موٹی موٹی بدیوں کی لسٹ دیتا ہوں تا کہ ان کے ذہن میں آنے سے ان سے بچنے کی طاقت پیدا ہو۔ ان سے آگے جو بدیاں ہیں وہ الہام کے ذریعہ بتائی جاتی ہیں۔

(۱) تکبر یعنی اپنے نفس میں اپنے آپکو بڑا سمجھنا۔ کسی اور پر ظاہر کئے بغیر ایک شخص اپنے نفس میں سمجھتا ہے کہ مَیں بڑا آدمی ہوں تو یہ بات اس کے نفس کو طہارت حاصل کرنے سے روکتی ہے۔

(۲) سلفہ پن، بازاروں میں آوارہ طور پر پھرنا یا بیٹھنا اور ذلیل پیشے اختیار کرنا۔ یہ بھی نفس کی بدی ہے اور اس کی وجہ سے بھی اعلیٰ ترقی حاصل نہیں ہوسکتی۔ جب تک کوئی اپنی حالت اور پیشہ نہ بدلیگا۔

(۳) جلد بازی، کسی کام کو بے سوچے سمجھے جلدی میں اختیار کر لینا۔ اسکا نقصان بھی اختیار کرنے والے کو ہی پہنچتا ہے۔

(۴) بدظنی، یعنی دوسرے کے متعلق یہ خیال کرنا کہ وہ ایسا ہے۔ ویسا ہے خواہ اس پر اِس خیال کو کبھی ظاہر نہ کرے حتیٰ کہ مر جائے مگر پھر بھی یہ گناہ ہے۔

(۵) ناجائز محبت، خواہ دل میں ہی رکھے اور کسی کو نہ بتائے تو بھی یہ بدی ہے۔

(۶) کینہ، یعنی دل میں یہ خیال رکھنا کہ فلاں کو نقصان پہنچاؤں گا۔ چاہے عملاً کبھی بھی نقصان نہ پہنچائے۔

(۷) بزُدلی، بزُدلی کا دل میں پیدا ہونا گناہ ہے خواہ اُسکے اظہار کا کبھی موقعہ آئے یا نہ آئے۔

(۸) حسد یعنی دوسرے کے متعلق یہ خیال کرنا کہ اس کی چیز جاتی رہے اور مجھے مل جائے۔

(۹) بے صبری یعنی مصائب پر گھبرا جائے۔ اور جو کام اسے کرنا ہو وہ نہ کر سکے۔

(۱۰) دون ہمتی، انسان اپنے لئے بڑے مقصد قرار نہ دے بلکہ چھوٹے چھوٹے قرار دے۔ یہ بُرائی بھی بڑی تباہی کا موجب ہوتی ہے۔ یہ خصوصاً بادشاہوں اور امراء کے لئے سخت تباہی کا باعث ہے۔ کیونکہ اُن کی کم ہمتی سے ان کی رعایا بھی کم ہمت ہو جاتی ہے۔ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ السلام نے کیا عجیب نکتہ بیان فرمایا ہے۔ فرماتے ہیں:۔

تیرے منہ کی ہی قسم میرے پیارے احمدؐ   تیرے بڑھنے سے قدم آگے بڑھایا ہم نے

یعنی تو نے (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) ترقی کی تو ہم بھی آگے بڑھے۔ پس امراء کے لئے دون ہمتی بہت بڑا گناہ ہے اور عوام کے لئے بھی گناہ ہے۔

(۱۱) چاپلوسی۔ یونہی کسی کو خوش کرنے کے لئے باتیں بنانا چاپلوسی ہے۔ امراء کے نوکروں میں یہ بدی بہت زیادہ ہوتی ہے۔

(۱۲) ناشکری۔ اس سے دل میں کسی کے احسان کی قدر نہ ہونا مُراد ہے۔

(۱۳) بے استقلالی۔ ایک کام اختیار کرنا اور بغیر سرانجام دئے چھوڑ دینا بے استقلالی ہے۔

(۱۴) سُستی۔ اس کی وجہ سے انسان کام ہی نہیں کرتا۔

(۱۵) غفلت (۱۶) حق کا انکار (۱۷) حق کے اقرار کی جرأت کا فقدان۔

(۱۸) ناجائز نزاکت۔ یعنی وہ وجود جنہیں نزاکت نہ کرنی چاہئے۔ وہ کریں۔ یا کوئی اس حد تک نزاکت کرے کہ عمل سے ناکارہ ہو جائے۔

(۱۹) جہالت۔ یعنی علم حاصل نہ کرنا۔

(۲۰) حرص۔ اس میں مبتلا ہونا بھی بُرائی ہے۔

(۲۱) ریاء۔ یعنی لوگوں کو دکھانے کے لئے کام کرنا۔

(۲۲) بدخواہی۔ دل میں دوسرے کے نقصان کی خواہش رکھنا۔

(۲۳) ہمت ہار بیٹھنا۔ ذرا مشکل کا سامنا ہوا اور کام چھوڑ دیا۔ یہ بھی خاص طور پر اُمراء کی بدی ہے۔

(۲۴) بدی سے محبت۔ یعنی بدی کو دیکھ کر بُرا نہ منانا بھی گناہ ہے۔

(۲۵) ہر قسم کا نشہ بھی بدی ہے۔ اس میں شراب، افیون، بھنگ، نسوار، چائے، حقہ سب چیزیں شامل ہیں۔

بعض چیزیں ایسی ہیں جو غذا کے طور پر استعمال کی جاتی ہیں جیسے چائے ہے۔ اگر اسکی ایسی

عادت ہو کہ چھوڑنے پر صحت پر اثر پڑے تو اس کا استعمال بھی بُرائی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ ایک وقت یہ ضرورت پیش آئے کہ انسان دور دراز دیہاتوں میں تبلیغ کے لئے جائے اس وقت اگر وہ سماوار اٹھا لے جائے اور چائے کا انتظام کرنا چاہے تو یہ ایسا بوجھ ہوگا جس کی وجہ سے وہ بہت مشکلات میں مبتلا ہوگا۔ چونکہ اسلام یہ چاہتا ہے کہ ہر ایک مسلمان سپاہی بنے اور جہاں بھیجا جائے فوراً چلا جائے۔ اس لئے وہ اس قسم کی عادتوں سے منع کرتا ہے جو روک اوٹ کا باعث بن سکتی ہیں۔ مَیں نے کئی دفعہ سُنایا ہے۔ ایک دفعہ ایک سفر میں ایک پٹھان کی نسوار ختم ہوگئی تو اُس نے ایک کشمیری سے نہایت لجاجت کے ساتھ پوچھا۔ کیوں بھئی تمہارے پاس نسوار ہے۔ یہ دیکھ کر میں نے کہا۔ نسوار نے اس کی گردن اس کے سامنے جھکائی ہے۔

یہاں کئی لوگ آتے ہیں جنہیں حقہ کی عادت ہوتی ہے پھر وہ اس کی وجہ سے کئی فوائد سے محروم رہ جاتے ہیں۔ ابتداء میں ہمارے ایک رشتہ دار تھے جو حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے سخت مخالف تھے۔ اور جو لوگ یہاں آتے وہ انہیں گمراہ کرنے کی کوشش کرتے رہتے تھے ان کی عادت تھی کہ اپنے صحن میں چارپائیاں بچھا کر حقہ رکھ دیتے۔ لوگ حقہ کو دیکھ کر جاتے اور وہ گمراہ کرنے کی کوشش کرتے۔ اور کہتے ہم ان کے رشتہ دار ہیں اور ان کے حالات سے واقف۔ اگر کوئی بات ہوتی تو ہم نہ مان لیتے۔ اس طرح کئی لوگوں کو ٹھوکر لگ جاتی۔ ایک دفعہ ایک احمدی آیا اور حقہ پینے ان کے پاس چلا گیا۔ اُسے پہلے تو حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے خلاف باتیں سناتے رہے۔ لیکن جب وہ خاموش بیٹھا رہا تو پھر اس کے سامنے حضرت مسیح موعودؑ کو گالیاں بھی دیں۔ اس پر بھی وہ کچھ نہ بولا۔ آخر اُسے کہنے لگے تم کس سوچ میں ہو۔ کیوں کوئی بات نہیں کرتے۔ وہ کہنے لگا۔ مَیں اس سوچ میں ہوں کہ حقہ کی خبیث عادت مجھے یہاں لائی۔ اگر یہ نہ ہوتی تو مَیں نہ یہاں آتا اور نہ حضرت صاحب کے خلاف باتیں سُنتا۔

اِس وقت مَیں ضمناً یہ کہہ دینا چاہتا ہوں کہ پہلے بھی کئی بار اس طرف توجہ دلا چکا ہوں کہ حقہ بہت گندی چیز ہے۔ اِسی طرح دوسرے نشے بھی سخت مضر ہیں۔ ان کو ترک کر دینا چاہیئے۔ بعض نشے ایسے ہیں جن کی وجہ سے جھوٹ کی عادت پڑتی ہے۔ مَیں ان کے نام نہیں لیتا تا کہ جو ان کے

عادی ہیں۔ان کے متعلق بدظنی نہ پیدا ہو۔مگر یہ بات بالکل سچی ہے بعض نشوں سے اعصاب پر خاص اثر پڑتا ہے۔اس لئے کسی نشہ کی بھی عادت نہیں ڈالنی چاہئے۔ مجھے کسی چیز کی عادت نہیں ہوتی۔ مجھے بچپن میں بیماری کی وجہ سے افیون دیتے تھے۔ چھ ماہ متواتر دیتے رہے مگر ایک دن نہ دی تو والدہ صاحبہ فرماتی ہیں مجھ پر نہ دینے کا کوئی اثر نہ ہوا۔اِس پر حضرت صاحب نے فرمایا۔خدا نے چھڑا دی ہے تو اب نہ دو۔تو مَیں ہر چیز جو استعمال کرتا ہوں اگر چھوڑ دوں تو کوئی تکلیف نہیں ہوتی لیکن باوجود اس کے چائے جس کا استعمال ہمارے گھروں پر ناشتہ کے طور پر ہوتا ہے کبھی کبھی پینا چھوڑ دیتا ہوں کہ عادت نہ ہو جائے مومن کو کسی چیز کے نشہ کی عادت نہ ڈالنی چاہئے۔ یہ بھی ایک بُرائی ہے۔

(۲۶) دوسروں کو حقیر سمجھنا۔

(۲۷) دلی عداوت- عداوت کا خواہ اظہار نہ کیا جائے اور دل میں رکھی جائے۔تو یہ بھی بُرائی ہے۔

(۲۸) دوسروں پر بے اعتباری کرنا۔انسان دوسرے کے سُپرد کوئی کام کرتا ہوا ڈرتا ہے۔

(۲۹) طمع -یہ بھی قلبی بدی ہے۔

(۳۰) حد سے زیادہ غم کرنا بھی بدی ہے۔یعنی انسان غم کو اتنا بڑھائے کہ اس کی عملی طاقتوں کو مضمحل کر دے۔

(۳۱) حد سے زیادہ خوشی بھی بدی ہے۔

(۳۲) بے تعلق باتوں میں دخل دینا۔ایسی باتیں جن سے اس کا کوئی تعلق نہ ہو۔خواہ مخواہ کود پڑنا بھی بدی ہے۔

(۳۳) ہلکا پن-جس سے مُراد زیادہ باتیں کرنا ہے۔ جب کسی انسان کو زیادہ باتیں کرنے کی عادت ہوتی ہے تو وہ بے سوچے سمجھے جواب دیتا ہے۔

(۳۴) سنگ دلی-یعنی رحم نہ ہونا بھی ایک بدی ہے۔

(۳۵) دوسروں کو ایذا رسانی میں لذّت محسوس کرنا۔

(۳۶) اسراف (۳۷) خودکشی۔

(۳۸) وہ جھوٹ جس میں کسی کا نقصان نہ ہو۔ کئی لوگ بے فائدہ جھوٹ بولتے ہیں۔

اَب مَیں وہ بدیاں بیان کرتا ہوں جو دوسری مخلوق سے تعلق رکھتی ہیں۔ یہ دو قسم کی ہیں۔ اوّل وہ بدیاں جو انسانوں سے تعلق رکھتی ہیں۔ دوم وہ بدیاں جو انسانوں کے سوا دوسری مخلوق سے تعلق رکھتی ہیں۔

ایک دوست پوچھتے ہیں، حقہ چھوڑنے کی ترکیب بتاؤ۔ حقہ کی نسبت افیون چھوڑنے میں زیادہ تکلیف ہوتی ہے۔ ایک دوست تھے جنہوں نے بہت سال افیون کھائی۔ جب وہ چھوڑنے لگے تو ڈاکٹر نے کہا۔ اگر چھوڑ دو گے تو مر جاؤ گے۔ مگر انہوں نے چھوڑ دی۔ اس پر چند دن انہیں تکلیف رہی۔ مگر پھر ان کی صحت اچھی ہوگئی۔ نشے چھوڑنے کے کچھ علاج تو آگے بتاؤں گا۔ لیکن اس وقت مضمون کو خراب کئے بغیر جو بتا سکتا ہوں وہ یہی ہے کہ چھوڑ دو۔

وہ بدیاں جو انسانوں سے تعلق رکھتی ہیں وہ یہ ہیں۔ (۱) بے ادبی۔ جن کا ادب کرنا ضروری ہو ان کا ادب نہ کرنا بھی بدی ہے۔ (۲) ناجائز اظہارِ محبت۔ (۳) بے وفائی یعنی آپ تو کام کراتے رہے لیکن جب دوست کو مدد کی ضرورت ہوئی تو جواب دے دیا۔ (۴) چھچھورا پن: اس کی تعریف یہ ہے کہ جلد غصہ میں آ جانا۔ ناشائستہ اشارے کرنا۔ فوراً سزا دینے پر آمادہ ہو جانا۔ یونہی سزا دینے کی دھمکیاں دینا۔ مَیں نے کئی دفعہ قادیان کے دو بنیوں کا قصہ سُنایا ہے۔ ایک دوسرے کو گالی دے رہا تھا اور دوسرا کہہ رہا تھا کہ اَب گالی دو تو تمہارا سر پھوڑ دوں گا۔ اگر اُسے سر پھوڑنا تھا تو پہلی دفعہ گالی دینے پر ہی پھوڑ دیتا۔ نئی گالی دلوانے کی کیا ضرورت تھی۔ مگر وہ ہر دفعہ یہی کہتا جاتا کہ اب گالی دو تو سر پھوڑ دوں گا۔ آگے سے دوسرا کہتا۔ سو دفعہ گالی دوں گا مگر دیتا نہ تھا۔ مَیں اس وقت آٹھ سال کا بچہ تھا اور اس نظارہ کو دیکھ کر وہاں کھڑا ہو گیا تھا مگر باوجود اس انتظار کے کہ ایک گالی دے اور دوسرا سر پھوڑے کچھ بھی نتیجہ نہ نکلا۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ اپنی اپنی دوکان پر چلے گئے۔ اور اُسوقت ایک نے دوسرے کو پھر گالی دی اور دوسرا باہر آ کر پھر کہنے لگا کہ اب گالی دو تو مزا چکھاؤں۔ بہت دیر تک وہ اسی طرح کرتے رہے۔ یہ چھچھورا پن ہے اور بُزدلی کی علامت

ہے۔اسی طرح سزا میں حد سے زیادہ سختی کرنا بھی چھچھوراپن ہے۔ یا ذرا کسی سے تکلیف پہنچی اور شور مچا دیا یہ بھی چھچھوراپن ہے۔

مَیں نے دورانِ تقریر میں سوال کرنے سے روکا ہوا ہے۔مگر یہ مضمون چونکہ اہم ہے اس لئے بعض سوالات جو دوستوں نے کئے ہیں اُن کے جواب دینا ضروری سمجھتا ہوں ایک دوست پوچھتے ہیں کہ کونسے پیشے ذلیل ہیں۔اس سوال کے ذریعہ وہ مجھے ایسے دلدل میں گھسیٹ کر لے جانا چاہتے ہیں جس میں جانا نہیں چاہتا۔مگر مَیں اُن کو جواب نہ دینا بھی نہیں چاہتا۔اس لئے بتاتا ہوں کہ وہ پیشے ذلیل ہیں جو انسان کو موجودہ حالت سے آئندہ ترقی میں روک پیدا کریں۔

ایک سوال یہ کیا گیا ہے کہ حقہ پینے والے کی وصیت منظور ہوسکتی ہے یا نہیں؟ یہ چونکہ پیچیدہ سوال ہے اس لئے اس وقت اس کا جواب نہیں دیتا۔

ایک سوال یہ پوچھا گیا ہے کہ طمع اور حرص میں کیا فرق ہے۔اس کا جواب یہ ہے طمع تو یہ ہے کہ انسان دوسرے سے اُمید رکھے کہ فلاں چیز مجھے دے دے۔اور حرص یہ ہے کہ فلاں چیز مل جائے خواہ کہیں سے مل جائے۔

(۵) گالیاں دینا۔اسے ہر جگہ کے لوگ بُرائی سمجھتے ہیں۔لیکن پنجاب میں رواج ہے کہ بچہ سے کہتے ہیں کہ فلاں کو گالی دو اور جب وہ گالی دیتا ہے تو ہنستے ہیں۔ گویا ان کے نزدیک معراج گالی دینا ہی ہے۔ یہ واقعہ مَیں نے خود بھی دیکھا ہے۔

(۶) لعنتیں ڈالنا۔(۷) بددُعا۔لعنت اور بددُعا میں مَیں نے فرق کیا ہے اور وہ یہ ہے کہ بددُعا انسان کی جسمانی حالت کے متعلق ہوتی ہے اور لعنت روحانیت کے متعلق ہوتی ہے۔ مثلاً جب کوئی یہ بددُعا دیتا ہے کہ فلاں مرجائے تو یہ بددُعا ہے اور جو کہتا ہے۔فلاں پر لعنت ہو۔اس کا یہ مطلب ہوتا ہے کہ اُس کا دل ناپاک ہوجائے۔

مَیں اس سے وہ لعنت مستثنٰی کرتا ہوں جو بددُعا کے طور پر نہیں بلکہ اظہار واقعہ کے طور پر ہوتی ہے اور وہ نبی کی طرف سے لعنت ہوتی ہے۔ وہ بددُعا نہیں ہوتی بلکہ اس بات کا اظہار ہوتا ہے کہ جس پر لعنت کی جاتی ہے اس کا دل ناپاک ہوگیا ہے۔

(۸) خیانت۔ کسی نے مال دیا۔ تو اُسے واپس نہ دیا۔ یا پورا نہ دیا۔

(۹) افشاء راز۔ کسی کا کوئی راز معلوم ہوا تو اُسے ظاہر کر دیا۔ مگر یہ کبھی بدی نہیں بھی رہتی۔ مثلاً ایسے وقت میں جب کسی دوسرے کو نقصان پہنچ سکتا ہو تو اُسے نقصان سے بچانے کے لئے راز افشاء کرنا بُرا نہیں ہوتا۔ مثلاً کسی کو معلوم ہو کہ ایک شخص کا ارادہ ہے کہ زید کو قتل کر دے۔ اب اگر زید کو یہ بات بتا دی جائے تو یہ بدی نہیں ہوگی۔ بلکہ اس کا چھپانا بدی ہوگا۔ اِسی طرح حکومت کے خلاف کوئی سازش کرتا ہے اُسے بدنام کرتا ہے یا اُسے نقصان پہنچانا چاہتا ہے۔ تو جس کو یہ راز معلوم ہو اُسکا فرض ہے کہ ذمہ وار آدمیوں تک یہ بات پہنچائے۔

(۱۰) چغل خوری (۱۱) بشاشت سے نہ ملنا۔ اس سے دوسرے کے قلب پر بُرا اثر پڑتا ہے اور تعلقات محبت قطع ہو جاتے ہیں۔

(۱۲) ناواجب طرفداری۔ دو آدمی لڑ رہے ہوں۔ اُن میں ایک دوست ہو۔ تو اس کی بیجا حمایت کی جائے۔

(۱۳) دھوکہ بازی (۱۴) بخل (۱۵) ظلم (۱۶) ظاہری ناشکری۔ یعنی جس کا احسان ہو اس کے متعلق یہ کہنا کہ اس نے کبھی احسان نہیں کیا۔

(۱۷) غلاظت (۱۸) غفلت (۱۹) جھگڑا (۲۰) فساد۔ مَیں ان کی تشریح چھوڑتا ہوں کیونکہ لوگ یہ باتیں جانتے ہیں۔

(۲۱) شور مچانا۔ بازاروں میں کھڑے ہو کر شور مچانا یا اجتماع میں اِدھر اُدھر کی باتیں کر کے شور پیدا کرنا۔ اور کام کرنے والوں کے کام میں حرج پیدا کرنا بھی ایک بہت بڑا عیب ہے۔ اہل یورپ کو مَیں نے دیکھا ہے اس بات کا خاص خیال رکھتے ہیں۔ مجالس میں جونہی ایک طرف سے خاموشی شروع ہو سب خاموش ہو جاتے ہیں۔ اس لئے کہ جب خاموش ہو گئے انہیں ہماری آواز سے تکلیف نہ پہنچے۔

(۲۲) ایذا رسانی (۲۳) جبر (۲۴) ڈاکہ (۲۵) قتل (۲۶) چوری۔ مَیں انتظار کر رہا تھا کہ اس کے متعلق بھی کوئی سوال آئے۔ چنانچہ ایک دوست سوال کرتے ہیں کہ لوگ مراسم دوستانہ

کے طور پر چوری کرتے ہیں۔ چنانچہ بعض گاؤں میں دستور ہے کہ ایک دوسرے کا مال چُرا لیتے ہیں۔ یہ بھی بُرائی ہے۔

(۲۷) مار پیٹ (۲۸) فخر بے جا (۲۹) بہتان لگانا (۳۰) غیبت کرنا (۳۱) عیب چینی کرنا۔ عیب چینی اور غیبت میں فرق ہے اور وہ یہ کہ غیبت کے معنی ہیں کسی کی بدی لوگوں میں بیان کرنا تا کہ وہ ذلیل ہو اور چغل خوری یہ ہے کہ اگر کسی شخص کے متعلق کوئی شخص کوئی بُری بات بیان کرے تو اُسے جا کر بتانا اور ان کی آپس میں لڑائی کرانا۔

(۳۲) عیب لگانا۔ (۳۳) تحقیر کرنا۔ لوگوں میں ذلیل قرار دینا (۳۴) نام دھرنا جیسا کہ ہمارے ملک میں لوگوں کے مختلف قسم کے نام رکھ دئے جاتے ہیں۔

(۳۵) استہزاء کرنا۔ یعنی حقیر اور ذلیل کرنے کے لئے ہنسی تمسخر کرنا۔

(۳۶) منہ چڑانا۔ بچوں اور عورتوں میں یہ بہت عادت ہوتی ہے۔

(۳۷) منصوبہ بازی کرنا۔ یعنی یہ سوچنا کہ فلاں کو کس طرح نقصان پہنچایا جائے۔

(۳۸) تعذیب۔ یعنی بجائے سزا کے دُکھ دینا۔

(۳۹) غصہ ہونا۔ وہ غصہ جس کا اظہار کیا جائے۔

(۴۰) انتقام میں شدّت۔ یعنی جتنا انتقام لینا چاہئے اس سے زیادہ لینا۔

(۴۱) رشوت لینا۔ (۴۲) رشوت دینا۔ (۴۳) سود لینا۔ (۴۴) سود دینا۔ یہ موٹی موٹی بدیاں ہیں جو دوسرے انسانوں سے تعلق رکھتی ہیں۔

اَب میں وہ بدیاں بیان کرتا ہوں جو انسانوں کے علاوہ دوسری مخلوق سے تعلق رکھتی ہیں:

(۱) بدبودار چیزیں استعمال کرنا۔ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا ہے بدبودار چیزیں کھانے سے ملائکہ کو تکلیف ہوتی ہے اور وہ ایسے انسان کے پاس نہیں آتے۔

(۲) بلاوجہ گھر میں کتا رکھنا۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ آلہٖ وسلم نے فرمایا ہے۔ جس گھر میں کتّا ہو۔ وہاں فرشتے نہیں جاتے۔

اَب مَیں وہ بدیاں بیان کرتا ہوں جو دوسرے جانوروں سے تعلق رکھتی ہیں:

(۱) جانوروں کو بلا وجہ مارنا۔

(۲) جانوروں سے زیادہ کام لینا۔ اس بُرائی میں عام طور پر زمیندار مبتلا ہوتے ہیں۔ وہ جانور سے کام لیتے رہتے ہیں اور جب وہ کام دینے کے ناقابل ہو جاتا ہے اور مرنے لگتا ہے تو مذبح والوں کے پاس بیچ دیتے ہیں۔ میرا یہ مطلب نہیں کہ ذبح کرنا ناجائز ہے بلکہ یہ کہ اس طرح کام لینا کہ وہ تکلیف سے کام کے ناقابل ہو جائے یہ ناجائز ہے۔

(۳) جانوروں کو کھانا کم دینا اور کام زیادہ لیتے رہنا۔ اس بُرائی میں زمیندار نہیں مبتلا ہوتے دوسرے ہوتے ہیں۔ زمینداروں کو تو دیکھا ہے کہ وہ خود بھوکے رہیں گے مگر جانوروں کے چارے کا ضرور انتظام کریں گے۔ مجھے زمینداروں کا یہ فقرہ بہت پسند آتا ہے کہ جب قحط پڑتا ہے تو یہ نہیں کہتے۔ ہمارے کھانے کے لئے کچھ نہیں رہا۔ بلکہ یہ کہتے ہیں چارہ نہیں ملتا۔ (۴) بیمار جانور کا علاج نہ کرنا۔

(۵) جانوروں کی تعذیب- داغ دینا۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک دفعہ دیکھا ایک گدھے کہ منہ پر نشان لگا ہوا تھا۔ آپ نے فرمایا یہاں مت لگاؤ۔ کیونکہ اس جگہ حس زیادہ تیز ہوتی ہے۔ اگر نشان لگانا ہی ہے تو پیٹھ پر لگا دو۔

(۶) جانوروں کی سردی گرمی کا خیال نہ رکھنا۔

(۷) جانوروں کے شہوانی جذبات کا خیال نہ رکھنا۔ جانوروں میں بھی ایسے ہی قویٰ ہوتے ہیں جیسے انسانوں میں۔ اس لئے یا تو اُن کی شہوت دور کرنے کا انتظام کرنا چاہیئے یا کوئی اور تدبیر کرنی چاہیئے۔

(۸) اولاد کی وجہ سے دُکھ دینا۔ یعنی اُن کے سامنے اُن کے بچوں کو ذبح کرنا یا بھوکے رکھنا یا اور کسی طریق سے دُکھ دینا۔

اَب مَیں تیسری قسم کی بدیاں بیان کرتا ہوں جو قومی بدیاں ہیں:

(۱) فحش کی اشاعت کرنا۔ اگر کوئی شخص لوگوں میں یہ کہتا پھرتا ہے کہ فلاں شخص جھوٹا ہے تو یہ صرف دوسرے انسان سے تعلق رکھنے والی بدی نہیں بلکہ قومی بدی ہے۔ کیونکہ جس قوم میں یہ

اعلان ہوتا رہے کہ اس میں جھوٹ بولنے والے بھی ہیں۔ اُس میں جھوٹ کی عظمت مٹ جاتی ہےاوراس میں یہ بدی پھیلنےلگتی ہے۔میرے نزدیک فحش کی اشاعت خودکشی ہے۔

(۲) نفسانیت - جب قوم کے فوائد کے مقابلہ میں اپنے فوائد ٹھکرائیں تو اپنے فوائد کو مدّ نظر رکھنا اور قومی فوائد کونظر انداز کر دینا قومی بُرائی ہے۔

(۳)فسق وفجور- جیسے کنچنیوں کا پیشے بیٹھنا یا علی الاعلان شراب پینا۔

(۴)قومی فرائض کی ادائیگی میں سُستی کرنا۔(۵) تربیت اولاد کی طرف توجہ نہ کرنا۔

(۶)تعلیم اولاد کی طرف توجہ نہ کرنا۔ جولوگ اِن باتوں کی طرف توجہ نہیں کرتے وہ قوم کو تباہ کرتے ہیں۔ کیونکہ اولاد نے ہی آگےقوم بننا ہوتا ہے۔

(۷) غلاظت - یہ پہلے بھی بیان کی گئی ہے۔ وہاں اسلئے بیان کی گئی تھی کہ اس سےلوگوں کو بُو آتی ہےاور تکلیف ہوتی ہے۔لیکن یہاں اس لئے اسے بیان کیا گیاہے کہ اس سے بیماریاں بھی پیدا ہوتی ہیں۔جن سےقوم تباہ ہوتی ہے۔

(۸) ذمہ داری کے احساس کا فقدان-فقدان کےمعنی ہیں کسی چیز کا نہ پایا جانا۔یعنی انسان یہ محسوس نہ کرے کہ میرے اُوپر جوکام تھا اس کا کرنا میرا فرض تھا۔

(۹) کام یا ذمہ داری کو پورا نہ کرنے اور نقصان ہو جانے کی صورت میں برداشت نہ کرنا۔ خواہ غلطی سے کام نہ کیا ہو یا جان بوجھ کر۔

(۱۰)بغاوت۔

ایک دوست نے ایک سوال کیا ہے۔ چونکہ مَیں خود بھی اس کے متعلق بیان کرنا چاہتا تھا اس لئے اسی موقعہ پر جواب دیتا ہوں۔ وہ دوست کہتے ہیں۔ ہماری جماعت کومخالفین کے مقابلہ میں درشت کلامی اور بدزبانی سے کام نہیں لینا چاہئے۔انہوں نے ہماری جماعت کے لیکچراروں اور واعظوں کوتوجہ دلائی ہے کہ وہ سخت الفاظ استعمال نہ کیا کریں۔مَیں بھی اس کے متعلق تاکید کرتا ہوں۔ وہ میری تحریروں میں کبھی ایسے الفاظ نہیں دیکھینگے کیا مجھے حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے خلاف بدزبانی اور گالیاں سُنکر رنج نہیں ہوتا؟ ہوتا ہے۔لیکن مَیں نے کبھی درشت

کلامی کے جواب میں درشت کلامی سے کام نہیں لیا۔ بعض لوگ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کی بعض تحریروں کا حوالہ دیتے ہیں۔ انہیں یاد رکھنا چاہیئے ۔ حضرت صاحب بحیثیت مجسٹریٹ تھے اور اُن کا فرض تھا کہ لوگوں کو اُن کی اصل حقیقت بتاتے۔ مگر ہماری یہ پوزیشن نہیں ہے اور درشت کلامی اور گالیاں دینا نفس کی کمزوری کی علامت ہے۔ آجکل ممکن ہے کسی کا اس سے دل خوش ہو جائے مگر آئندہ جو اولاد ہوگی وہ جب ان تحریروں کو پڑھے گی تو کہے گی۔ کاش! ہمارے باپ دادا ایسا نہ کرتے۔ کیونکہ وہ ٹھنڈے دل سے ان تحریروں کو پڑھیں گے۔ انکوطیش نہ ہوگا۔ ان کے سامنے مخالفین کی تحریریں نہ ہونگی۔ اسوقت وہ ان کتابوں اور اخباروں کو چھپاتے پھرینگے جن میں سخت اور درشت الفاظ ہونگے۔

(۱۱) مہمانداری کے جذبہ کا نہ ہونا۔ یہ بھی قومی بدی ہے۔

(۱۲) تجارت میں فریب کرنا بھی قومی بدی ہے۔

حدیث میں آتا ہے رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم وعظ فرمارہے تھے کہ یکے بعد دیگرے لوگوں نے سوال کرنے شروع کر دیئے۔ اس پر آپ کو جوش آ گیا اور آپ نے فرمایا کرو جس قدر سوال کرنا چاہتے ہو۔ مَیں وعظ چھوڑتا ہوں۔ اب پوچھو جو پوچھنا چاہتے ہو۔ مَیں قیامت تک کی باتیں بتاتا ہوں۔ اِسی طرح اسوقت مَیں کہتا ہوں۔ سوال پر سوال آرہے ہیں۔ کیا مَیں لیکچر چھوڑ کر سوالوں کے جواب دینا شروع کر دوں۔ جو مضمون میں بیان کر رہا ہوں اس کے نوٹوں کے ابھی تک صرف پینتیس صفحے بیان کر سکا ہوں اور پچیس باقی ہیں۔ اگر مَیں نے سوالوں کے جواب دینے شروع کر دیئے تو مضمون کس طرح ختم ہوگا۔

مَیں یہ بیان کر رہا تھا کہ تجارت میں فریب کرنا بھی قومی بدی ہے۔ کیونکہ اس سے قوم کا اعتبار اُٹھ جاتا ہے۔ مَیں جب کشمیر گیا تو مَیں نے تحقیقات کی کہ چاندی کے برتنوں اور شال وغیرہ کی تجارت جو ایک کروڑ کی تھی لوگوں کی بددیانتی کی وجہ سے اب صرف سترہ لاکھ کی رہ گئی ہے۔

(۱۳) کارکنوں پر بے تعلق آدمیوں کے سامنے نکتہ چینی کرنا۔

(۱۴) بغیر کسی کا نام لئے قوم کی عام بدی کا اعلان کرنا۔ مثلاً یہ کہنا ہم میں بڑے فریب

کرنیوالے لوگ ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ قوم ایسی ہی ہو جاتی ہے۔

(۱۵) قومی اغراض میں مدد دینے سے دریغ کرنا۔

(۱۶) جن لوگوں سے قوم کو نقصان پہنچے اُن سے دوستی اور تعلق رکھنا۔

(۱۷) حکومت یا جماعت کے کارکنوں سے تعاون نہ کرنا۔

(۱۸) اطاعت کی کمی۔

اب مَیں وہ بدیاں بیان کرتا ہوں جو خدا تعالیٰ سے تعلق رکھتی ہیں:

(۱) بلا وجہ قسم کھانا۔ مجسٹریٹ کے سامنے قسم کھانی پڑے یا کوئی اور ایسا اہم معاملہ ہو جس کے متعلق قسم کھانا ضروری ہو تو قسم کھا سکتا ہے۔ ورنہ یونہی قسم کھانا گویا خدا تعالیٰ کے نام کی تخفیف کرنا ہے۔

(۲) مایوسی کہ اب میری مشکلات دُور نہیں ہو سکتیں۔ یہ خدا تعالیٰ پر بدظنی کے نتیجہ میں پیدا ہوتی ہے۔ (۳) دل میں گندگی جمع کرنا۔ خدا تعالیٰ نے اسلئے دل پیدا کیا ہے کہ اُسے اپنا گھر بنائے اِسی لئے دل بیت اللہ کہلاتا ہے اور جو دل کو خراب کرتا ہے وہ گویا خدا کو اس کے گھر میں آنے سے روکتا ہے۔

(۴) احکام شریعت کا انکار (۵) پانچویں بدی عقائد باطلہ میں مثلاً شرک وغیرہ۔

(۶) چھٹی بدی تمام عقائد حقہ کا انکار ہے۔ مثلاً خدا تعالیٰ کا، ملائکہ کا، رسولوں کا، الہام کا بہشت کا، دوزخ کا انکار۔

(۷) ساتویں بدی احکام شریعت کا خواہ وہ عبادت کے متعلق ہوں یا تمدّن کے متعلق توڑنا ہے۔ جیسے نماز نہ پڑھنا۔ حج نہ کرنا۔ ورثہ کے متعلق جو احکام ہیں اُن کی تعمیل نہ کرنا۔ اخلاق کی پابندی نہ کرنا۔ کیونکہ جب ان احکام کو خدا تعالیٰ نے اپنی طرف منسوب کر لیا ہے تو اُن کو توڑنا گویا اللہ تعالیٰ کو ناراض کرنا ہے۔ پس جس طرح اِن امور کی پرواہ کرنے سے بندوں کو تکلیف ہوتی ہے خدا تعالیٰ کی بھی ناراضگی ہوتی ہے۔

(۸) آٹھویں بدی خدا تعالیٰ سے محبت میں کمی ہے۔

(۹) نویں بدی خدا تعالیٰ اور رسول کی بے ادبی ہے۔

(۱۰) جسقدر بدیاں دوسروں سے تعلق رکھتی ہیں وہ خدا تعالیٰ سے متعلق بھی ہیں۔ مثلاً ناشکری ہے۔ یہ انسانوں کے متعلق ہوتی ہے۔ اور خدا تعالیٰ کے متعلق بھی ہو سکتی ہے۔ اِسی طرح اور بھی کئی باتیں ہیں۔

اب مَیں نیکیاں بیان کرتا ہوں۔ پہلے ذاتی نیکیاں لیتا ہوں۔

(۱) شجاعت بہادری (۲) چستی (۳) علم سیکھنا (۳) تواضع (۵) غیرت یعنی کوئی بدی ہوتی دیکھے تو بُرا منائے (۶) شکر (۷) حُسن ظنی (۸) دلی خیر خواہی (۹) محنت یعنی خوب کام کرنے کی عادت (۱۰) حیا (۱۱) رحم دلی۔ کسی کی تکلیف کو دیکھ کر اس کے متعلق احساس ہونا (۱۲) استقلال یعنی نیکی کو جاری رکھنا۔ (۱۳) وقار یعنی بے فائدہ اور بلا وجہ دوسروں کی کسی بات میں نقل نہ کرنا۔ ہمارے ملک میں یہ عیب بہت پایا جاتا ہے۔ جو بات انگریز کریں اس کی نقل کرنے لگ جاتے ہیں۔ (۱۴) بلند ہمتی (۱۵) صبر (۱۶) حریّت ضمیر یعنی بلا وجہ کسی کی تقلید نہ کرنا۔ (۱۷) شکر قلبی یعنی دل میں محسوس کرنا کہ فلاں نے احسان کیا ہے۔ (۱۸) تحقیق حق یعنی سچائی کو تلاش کرنا۔ (۱۹) کسی کی خوبی کا دلی اعتراض۔ (۲۰) رافت۔ رحم دلی اور رافت میں یہ فرق ہے کہ رحمدلی تو یہ ہے کہ لوگوں کو تکلیف میں دیکھ کر مدد دینے کا خیال پیدا ہونا۔ اور رافت یہ ہے کہ کسی کی تکلیف کو دیکھ کر دُکھ محسوس ہونا۔ (۲۱) اپنے حق کی خاطر مقابلہ کرنیکی قوت۔ یہ اور بات ہے کہ کسی پر عفو کر کے کوئی اپنا حق چھوڑ دے۔ یا یوں اپنی سُستی سے نہ لے لیکن کسی سے دب کر حق نہیں چھوڑنا چاہئے۔

(۲۲) سباق کی قوت یعنی یہ طاقت کہ نیکیوں میں دوسروں سے آگے نکلوں۔

(۲۳) اپنی ہزیمت اور شکست تسلیم نہ کرنا۔ خواہ کئی دفعہ ہارے۔ مگر اپنی ہار نہ مانے۔ یہ مطلب نہیں کہ منہ سے اقرار نہ کرے بلکہ اس پر راضی نہ ہو۔ اور اس کے اثر کو دور کرنیکی کوشش کرتا رہے۔

(۲۴) چوکس رہنا۔ یعنی اپنے دشمن سے غافل نہ ہونا۔ (۲۵) اقرار حق (۲۶) قوت

برداشت کا ہونا۔ یعنی تکلیفیں برداشت کرنے کی طاقت ہونا۔ (۲۷) جفاکشی کا عادی۔ خواہ کتنا کام آپڑے گھبرائے نہیں۔ (۲۸) جرأت۔ (۲۹) نیکی سے محبت (۳۰) لوگوں کی مدد کی خواہش کہ اگر موقعہ ملے تو ضرور مدد کروں۔ (۳۱) سادہ زندگی بسر کرنا۔ اپنے نفس کی آسائش پر روپیہ زیادہ صرف نہ کرنا۔ (۳۲) اپنی عزّت کی حفاظت کرنا۔ (۳۳) دوسروں کی خوبیوں کا اقرار کرنا۔ (۳۴) ہر بات میں میانہ روی اختیار کرنا۔

اَب میں وہ نیکیاں بیان کرتا ہوں جو دوسروں سے تعلق رکھتی ہیں:

فرشتوں سے تعلق رکھنے والی نیکیاں یہ ہیں:- (۱) ذکرالٰہی - لکھا ہے جہاں ذکرالٰہی ہوتا ہے وہاں فرشتے ٹوٹ ٹوٹ پڑتے ہیں۔ اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم فرماتے ہیں۔ وہاں فرشتے گھیرا ڈال لیتے ہیں۔ (۲) طہارت ظاہری۔ یہی وجہ سے کہ جہاں ملائکہ کے نزول کے مواقع ہوتے ہیں وہاں خوشبو لگا کر جانے کا حکم ہے۔ جیسے جمعہ کے لئے نہانا اور خوشبو لگانا مسنون ہے۔

اَب میں وہ نیکیاں بیان کرتا ہوں جو انسانوں سے تعلق رکھتی ہیں:-

(۱) عدل۔ (۲) احسان۔ (۳) احسان کا شکریہ۔ (۴) صفائی پسندی۔ (۵) سخاوت (۶) وفاداری۔ (۷) رحم کرنا عملاً۔ (۸) دوستانہ۔ (۹) حلم۔ اس سے مراد یہ ہے کہ اگر کسی سے کوئی غلطی ہو جائے تو اسکے جو نیک پہلو ہوں انکو سوچ کر چھوڑ دینا۔ عفو تو یہ ہے کہ قصور وار سمجھ کر معاف کر دینا۔ مگر حلم یہ ہے کہ اس کی خوبیوں کی وجہ سے درگذر کرنا۔ (۱۰) ایثار۔ (۱۱) قرض روپیہ دینا۔ (۱۲) صدقہ۔ (۱۳) تعاون۔ (۱۴) دیانت۔ (۱۵) صلح جوئی۔ یعنی صلح کی کوشش کرنا۔ (۱۶) عفو یعنی معاف کر دینا۔ (۱۷) عہد کی پابندی۔ (۱۸) گرے ہوئے لوگوں کو بلند کرنے کی کوشش کرنا۔ (۱۹) دوسروں کا اعزاز اور اکرام کرنا۔ (۲۰) دوسروں کا ادب کرنا۔ اعزاز تو یہ ہے کہ جو برابر کا ہے اس کی عزت کرنا۔ اور ادب یہ ہے کہ بڑوں کا احترام کرنا۔ (۲۱) اگر لوگوں میں لڑائی ہو تو اُن کی صلح کرانا۔ (۲۲) اخوت۔ (۲۳) رازداری۔ (۲۴) بشاشت۔

اَب میں وہ نیکیاں بیان کرتا ہوں جو دوسرے جانوروں سے تعلق رکھتی ہیں:

(۱) انکی غذا کا خیال رکھنا۔ (۲) انکی طاقت کے مطابق ان سے کام لینا۔ (۳) جن جانوروں سے کام نہ لیا جائے انکو بھی کھانا دینا۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ایکدفعہ کئی دن تک بارش ہوتی رہی اور پرندوں کو دانہ نہ ملا۔ ایک شخص نے انکو دانہ ڈالا۔ اس وجہ سے اُسے ایمان نصیب ہوا اور وہ جنت میں چلا گیا۔ قرآن کریم میں بھی آتا ہے۔ **والذین فی اموالھم حقّ معلوم. للسّآئلِ والمحروم** (۷۰:۲۵/۲۶) مومنوں کی یہ بھی ایک صفت ہے کہ ان کے مال میں ان کا بھی حصہ ہوتا ہے جو مانگ سکتے ہیں۔ اور جو نہیں مانگ سکتے ان کا بھی حصہ ہوتا ہے۔ نہ مانگ سکنے والوں میں حیوانات اور پرند شامل ہیں۔ اُن کو بھی کھانے کے لئے دینا چاہئے۔ (۴) بے زبان جانوروں کی سردی گرمی اور اُن کے شہوانی جذبات اور ان کی اولاد کا خیال رکھنا بھی ضروری ہوتا ہے۔

اَب مَیں وہ نیکیاں بیان کرتا ہوں جو قومی نیکیاں ہیں۔

(۱) زکٰوۃ دینا۔ (۲) ضروریات قومی کے لئے چندہ دینا۔ (۳) مہمان نوازی کرنا۔ (۴) خدمتِ قومی کرنا۔ (۵) اطاعتِ حکّام۔ (۶) حکام سے تعاون کرنا۔ (۷) حفاظت ملک کرنا۔ (۸) ذمہ داری کا احساس۔ (۹) غلطی پر خوشی سے سزا بھگتنا۔ (۱۰) اشاعت حسنات یعنی لوگوں کی نیکیاں پھیلانا۔ (۱۱) دشمنانِ قوم سے اجتناب کرنا۔ (۱۲) قومی عزّت کی حفاظت کرنا۔ قوم پر اگر کوئی حرف لاتا ہو تو اس کی تردید کرنا۔ (۱۳) تجارت میں ایمانداری اور دیانتداری اختیار کرنا۔ (۱۴) تعلیم دینا۔ (۱۵) تربیت کرنا۔

اب میں وہ نیکیاں بیان کرتا ہوں جو خدا تعالیٰ سے تعلق رکھتی ہیں۔ (۱) ایمان میں کامل ہونا۔ (۲) محبتِ الٰہی۔ (۳) اعمال شریعت، عبادات اور معاملات کو پورا کرنا۔ (۴) رجا یعنی خدا تعالیٰ پر اُمید رکھنا۔ (۵) خوف یعنی خدا تعالیٰ کی عظمت سے خوف رکھنا۔ (۶) دلی پاکیزگی۔ (۷) توکل یعنی باوجود اپنی طرف سے کوشش کرنے کے یہ احساس ہونا کہ خدا تعالیٰ کی طرف سے ہی نصرت آئیگی تب کامیابی ہوگی۔ (۸) اخلاقِ حسنہ سے جو خدا تعالیٰ کے ساتھ تعلق رکھتے ہیں اُنکا خیال رکھنا۔ جیسے عہد کی پابندی وغیرہ ہے۔ (۹) تمام عقائدِ باطلہ کا ردّ کرنا۔ (۱۰) اللہ تعالیٰ کی

شان میں اگر کوئی شخص بے ادبی کرے مثلاً کہے اُس نے مجھے کیا دیا ہے۔ مجھ پر بڑا ظلم کیا ہے تو اُسے سمجھانا کہ یہ خدا تعالیٰ کے ادب کے خلاف ہے اس سے باز رہو۔ (۱۱) تبلیغ حق، شعائر اللہ کا ادب۔

اَب مَیں دوسرے سوال کو لیتا ہوں کہ کونسے مواقع ہیں کہ جن میں ان اعمال کو برتا یا ترک کیا جائے۔ اس کے جواب دو ہیں ایک اجمالی اور دوسرا تفصیلی۔ اگر تفصیلی جواب بیان کرنا چاہوں اور اس میں بھی اختصار سے کام لوں تب بھی کم از کم ۱۵-۲۰ گھنٹے چاہئیں۔ اس لئے مَیں اجمال کو لیتا ہوں اور موٹی موٹی باتیں بیان کرتا ہوں۔

(۱) وہ حق جو اللہ تعالیٰ کے بندے پر ہیں اسوقت تک اُن کو ترک نہ کرے جبتک مجبور نہ ہو جائے یا خدا تعالیٰ کا کوئی دوسرا حکم اُسے روک نہ دے۔ مثلاً ہاتھ یا منہ پر زخم ہے اِسوجہ سے وضو نہیں کر سکتا یا ہاتھ ہی نہیں اسلیئے اُسے دھو نہیں سکتا۔ یہ مجبوری ہے۔ اور دوسرا حکم مقابلہ میں آجانیکی مثال یہ ہے کہ خدا تعالیٰ کا حکم ہے عورت پردہ کرے لیکن یہ بھی خدا تعالیٰ کا حکم ہے کہ حج کے موقعہ پر خانہ کعبہ میں پردہ اُٹھا دینا چاہیئے۔ یہ دوسرا حکم پہلے کے مقابلہ میں آگیا اور اس کی وجہ سے خانہ کعبہ میں پردہ نہ کرنا ہی نیکی ہے۔ یا مثلاً حکم ہے کہ ماں باپ کی اطاعت کرو۔ یہ نیکی ہے لیکن اگر ماں باپ کا کوئی حکم خدا تعالیٰ کے مقابلہ میں آئے تو اسوقت اُسکا نہ ماننا ہی نیکی ہوگی۔

(۲) دوسرے کے متعلق کوئی ایسی بات نہ کرے کہ جس کا ویسے ہی حالات میں کرنا اپنے لئے پسند نہ کرتا ہو۔ مَیں اس میں ایک شرط لگاتا ہوں اور وہ یہ کہ میں نہیں کہتا کہ دوسرے سے وہ معاملہ کرے جو یہ پسند کرتا ہو۔ بلکہ مَیں یہ کہتا ہوں کہ کوئی بات دوسرے کے ساتھ ایسی نہ کرے جسے ویسے ہی حالات میں اپنے لئے پسند نہ کرے یا دوسرے کے ساتھ وہ سلوک نہ کرے جو ویسے ہی حالات میں اپنے لئے پسند نہ کرتا ہو۔ انجیل کا حکم ہے کہ تو دوسرے کے ساتھ ایسا ہی سلوک کر جیسا اپنے لئے پسند کرتا ہے۔ مگر یہ حکم صحیح نہیں ہے۔

(۳) افراط تفریط کا خیال رکھے بعض لوگ ہوتے ہیں وہ یا تو نفل پڑھنے ہی چھوڑ دیتے ہیں یا پھر اتنے پڑھتے ہیں کہ گھر بار کی فکر ہی نہیں کرتے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے پاس

ایک آدمی کے متعلق شکایت آئی کہ وہ دن کو روزہ رکھتا ہے اور رات کو نفل پڑھتا رہتا ہے۔ آپ نے اُسے بُلا کر فرمایا: وَلِنَفْسِکَ عَلَیْکَ حَقٌّ. کہ تیرے نفس کا بھی تجھ پر حق ہے یعنی تیری بیوی کا بھی تجھ پر حق ہے اُسے بھی ادا کرنا ضروری ہے۔

(۴) انسان اس رنگ میں عمل کرے کہ خدا تعالیٰ کی صفت کے ظہور سے ویسا ہی رنگ پیدا ہو جائے۔

اَب مَیں تیسرے سوال کو لیتا ہوں جو یہ ہے کہ کِس طرح معلوم ہو کہ کونسی بدیاں انسان کے اندر پائی جاتی ہیں۔ یہ معلوم کرنے کے کئی ذرائع ہیں: (۱) محاسبۂ نفس ہے۔ جب انسان کو معلوم ہو جائے کہ یہ بدیاں ہیں۔ یہ نیکیاں ہیں۔ تو پھر وہ غور کرے کہ ان میں سے کونسی بدی ہے، جو اس میں پائی جاتی ہے یا کونسی نیکی ہے جو نہیں پائی جاتی۔ (۲) اپنے کسی گہرے اور دلی دوست سے کہے کہ وہ اس کے نفس کا مطالعہ کرے۔ کیونکہ کبھی انسان اپنا عیب آپ معلوم نہیں کر سکتا اسلئے دوست سے کہے کہ وہ اسکے اعمال ظاہری کا مطالعہ کرے۔ یہ نہ کہے کہ تم میرے متعلق بدی کے لئے تجسس اور تلاش کرو۔ یہ گناہ ہے بلکہ کہے کہ جو ظاہر اعمال ہیں اُن میں جو نقص ہو وہ بتاؤ اِس طرح جو نقص وہ آپ معلوم نہ کر سکتا تھا اُسے دوست بتا دیگا مگر پھر بھی دوست دوست ہی ہوتا ہے کئی عیب وہ بھی چھوڑ دیگا اسلئے تیسرا طریق یہ اختیار کرنا چاہئے کہ جو عیب اُسے دوسروں میں نظر آتے ہوں اُنکے متعلق دیکھے کہ وہ مجھ میں تو نہیں پائے جاتے! مَیں بھی تو انہی افعال کو نہیں کرتا یا یہ کہ دوسروں میں جو نیکیاں نظر آئیں اُنکے متعلق دیکھے کہ مجھ میں ہیں یا نہیں۔ (۴) اس سے بھی بڑھکر ایک اور بات ہے اور وہ یہ دیکھے دشمن اُسپر کیا عیب لگا رہے ہیں؟ اور پھر سوچے کہ وہ عیب اس میں پائے جاتے ہیں یا نہیں۔ کئی عیب اس طرح معلوم ہو جائیں گے۔ اسی طرح یہ بھی دیکھے کہ دشمنوں کو مجھ میں کونسی نیکیاں نظر آتی ہیں۔ کئی دفعہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ نیکیوں کا اعتراف کرنے کے لئے دشمن بھی مجبور ہو جاتا ہے۔

(۵) بہت اہم اور بہترین ذریعہ بدیوں اور نیکیوں کے معلوم کرنے کا یہ ہے کہ تلاوت قرآن کریم کرتے وقت جہاں وہ عیب پڑھے جو خدا تعالیٰ نے پہلے قوموں کے بیان کئے ہیں

وہاں غور کرے کہ مجھ میں بھی تو یہ عیب نہیں۔اسی طرح جہاں قرآن کریم میں کسی نیکی کا ذکر آئے وہاں دیکھے کہ مجھ میں یہ نیکی پائی جاتی ہے یا نہیں۔ اِسکا ایک فائدہ یہ بھی ہوگا کہ چونکہ سب نیکیاں اور بدیاں ایک وقت میں انسان کے سامنے نہیں آسکتیں اسلئے آہستہ آہستہ تلاوت کے وقت آتی رہیں گی۔ دوسرے تلاوت کے وقت چونکہ خشیۃ اللہ پیدا ہوتی ہے اسلئے بدیوں سے بچنے اور نیکیاں اختیار کرنے میں بھی اُسے بہت مدد ملے گی۔

جو بدیوں کا علم ہو کر بھی انہیں نہیں چھوڑ سکتے اُن کا علاج

یہ باتیں ان لوگوں کے متعلق ہیں جن کے دلوں پر بدیوں کی وجہ سے زنگ نہ لگ چکا ہو۔مگر بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں جنہیں بدیوں کا علم ہوتا ہے مگر باوجود اسکے وہ انہیں چھوڑ نہیں سکتے۔ ان کا کیا علاج ہے۔مثلاً ایسے لوگ ہیں جنہیں پتہ ہے کہ نماز نہ پڑھنا گناہ ہے۔مگر نہیں پڑھتے۔ جانتے ہیں کہ قتل کرنا گناہ ہے مگر چھوڑ نہیں سکتے۔

اس سوال کا ایک تفصیلی جواب ہے مگر نہ وہ اس وقت لیکچر میں بیان ہوسکتا ہے اور نہ کسی چھوٹی موٹی کتاب میں لکھا جاسکتا ہے۔پس مَیں دس پندرہ نکتے اس سوال کے جواب میں اختصار کے ساتھ بیان کر دیتا ہوں۔

(۱) ایسے انسان کو سمجھ لینا چاہئے کہ اس کے دل پر زنگ لگ گیا ہے اور کوئی روک پیدا ہوگئی ہے جو اُسے نیکی نہیں کرنے دیتی اور بدی سے بچنے نہیں دیتی۔ اور یہ شامت اعمال ہے۔یعنی پچھلے گناہوں کا نتیجہ ہے۔اس کے لئے پہلا علاج یہ ہے کہ استغفار کرکے خدا تعالیٰ سے گزشتہ گناہوں کی معافی مانگے۔

استغفار کے متعلق یاد رکھنا چاہئے کہ اسکے معنی پردہ ڈالنے کے ہیں اور یہ دو قسم کا ہوتا ہے ایک حالت میں تو استغفار یہ ہوتا ہے کہ استغفار کرنیوالا کہتا ہے کہ خدایا ان گناہوں کو جو مَیں کر چکا ہوں مٹا دے یا جن میں گرفتار ہوں انکو دور کر دے اور دوسرا درجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان کہتا ہے۔الٰہی مجھ میں گناہ پیدا ہی نہ ہو۔جب انبیاء کے متعلق استغفار آتا ہے تو اسکے یہی معنی ہوتے ہیں کہ گناہ

کبھی پیدا ہی نہ ہو۔ دوسرا طریق یہ ہے کہ انسان اپنے اندر معرفت پیدا کرے۔ معرفت کے یہ معنی ہیں کہ صفاتِ الٰہیہ کو اپنے دل پر جاری کر کے صفات الٰہیہ کا مطالعہ کرے اور ان کو جذب کرنے کی کوشش کرے۔ مثلاً خدا تعالیٰ کی رحمانیت کو دیکھے اُس نے مجھ پر کتنے احسان کئے ہیں اور جب وہ کہتا ہے کہ میرے بندوں کو اپنے مال سے دو۔ تو مَیں کیوں نہ دوں۔ اِس طرح خدا تعالیٰ کی صفات پر غور کرنے سے بدیوں سے بچنے اور نیکیاں کرنیکا ملکہ پیدا ہوگا۔

۳- نیکی کے نیک انجام اور بدی کے بد انجام پر غور کرے۔ یعنی یہ دیکھے کہ فلاں نے نیکی کی تو اُسے یہ فائدہ پہنچا۔ اور فلاں نے بدی کی تو اُسے یہ نقصان اٹھانا پڑا۔ اس سے بھی عرفان حاصل ہوتا ہے۔

۴- جب یہ تینوں باتیں کر لے تو چہارم یہ کہ توبہ کرے۔ توبہ کا مفہوم یہ ہے (۱) گذشتہ گناہوں پر ندامت۔ یہ حالت دل میں پیدا ہو۔ (۲) جو فرائض ادا کرنے سے رہ گئے ہوں وہ ادا کرے۔ مثلاً حج رہ گیا ہے وہ کرے۔ مگر نماز ایک ایسا فرض ہے کہ وہ رہا ہوا پھر پورا نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے لئے استغفار ہی ہے۔ (۳) جو گناہ خدا نے چھپائے ہوئے ہوں یعنی جن پر خدا تعالیٰ نے پردہ ڈالا ہو اُن کے علاوہ جس جس کے گناہ یاد ہوں اس سے معافی مانگے۔ (۴) جن کو اس سے نقصان پہنچ چکا ہو ان کو فائدہ پہنچائے یعنی اُن سے حُسن سلوک کرے۔ (۵) آئندہ گناہ نہ کرنیکا عہد کرے۔ (۶) نفس کو نیکی کی طرف راغب کرے۔

یہ توبہ کی شرطیں ہیں انکو بجالائے تب توبہ حقیقی توبہ کہلا سکیگی اور منظور ہوگی۔

(۵) انسان تَخَلَّقُوْا بِاَخْلَاقِ اللّٰهِ کی حالت پیدا کرے۔ یہ نہ خیال کرے کہ اخلاص نہیں ہے بلکہ اپنی ذمہ واری سمجھ کر نیک کام کرتا ہی جائے۔ مثلاً صدقہ دینے پر تکلیف ہو تو دیتا ہی رہے یا نماز میں توجہ نہ قائم رہے تو بار بار پڑھتا رہے۔ اسکے متعلق یاد رکھنا چاہئے کہ انسان کا فرض یہی ہے کہ کام میں لگا رہے اور ہمت نہ ہارے۔ مَیں نے کئی دفعہ سنایا ہے حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام فرماتے تھے۔ ایک مرید اپنے پیر کو ملنے کے لئے آیا اور انہیں کے پاس ٹھہر گیا۔ رات کو پیر صاحب دُعا کرتے رہے کہ الٰہی فلاں کام ہو جائے۔ آخر آواز آئی۔ یہ کام تو نہیں ہوگا۔

یہ آواز مرید نے بھی سُن لی۔اس پر وہ حیران ہوا کہ اچھے پیر صاحب ہیں ہم تو ان سے دُعا کرانے کے لئے آتے ہیں۔لیکن خدا تعالیٰ کی طرف سے انہیں یہ جواب ملتا ہے کہ تمہاری دُعا منظور نہیں کی جائیگی خیر وہ چپکا ہو رہا۔ دوسرے دن پھر اُسی طرح ہوا کہ پیر صاحب ساری رات دُعا کرتے رہے۔ آخر انہیں پھر وہی جواب ملا۔ مرید اور بھی زیادہ حیران ہوا۔ تیسرے دن پھر اسی طرح ہوا۔آخر مرید نے انہیں کہا۔تین دن سے آپ کوئی دُعا کر رہے ہیں جس کے متعلق الہام ہوتا ہے کہ نہیں سُنی جائیگی۔ پھر کیوں آپ دُعا کرتے چلے جاتے ہیں۔ پیر صاحب نے کہا نادان! مَیں تو بیس سال سے یہی دُعا کر رہا ہوں اور مجھے یہی الہام ہو رہا ہے مگر مَیں نہیں گھبرایا۔اور تو تین دن جواب سن کر گھبرا گیا ہے۔ بات یہ ہے کہ خدا کا کام قبول کرنا یا نہ کرنا ہے اور میرا کام دُعا مانگنا ہے۔ وہ اپنا کام کر رہا ہے اور مَیں اپنا کام کر رہا ہوں۔لکھا ہے۔اسپر معاً الہام ہوا کہ اس عرصہ میں تم نے جتنی دُعائیں کی ہیں سب قبول کی گئیں۔

پس بندہ کا کام یہ ہے کہ اپنے کام میں لگا رہے۔نماز میں اگر توجہ قائم نہیں رہتی تو نہ رہے یہ اس کے بس کی بات نہیں ہے۔اس کا کام یہ ہے کہ نماز نہ چھوڑے۔مگر بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ جب انسان ظاہر میں نیکی کرتا ہے تو اس کا اثر باطن پر پڑتا ہے اور انسان پاک ہوتا جاتا ہے لیکن اگر اس طرح بھی کامیابی نہ ہو۔ انسان ارادے کرتا رہے مگر وہ ٹوٹ ٹوٹ جائیں۔اُٹھتا رہے مگر پھر گر گر جائے ہمت کرتا رہے لیکن ناکامی کا مُنہ دیکھنا ہی نصیب ہو۔ ایسے انسان کو یقیناً سمجھ لینا چاہیئے کہ اس کے دل پر بہت زنگ لگ گیا ہے اور اس کے دور کرنے کے لئے تفصیلی علاج کی ضرورت ہے کیونکہ اس پر نفس غالب آچکا ہے اور وہ مغلوب ہو گیا ہے اور وہ احساسِ انانیت جس کی طرف میری اس نظم میں جو کل پڑھی گئی اشارہ کیا گیا ہے۔ وہ مٹ گیا ہے اور وہ اس جانور کی طرح ہو گیا ہے جسے انسان نکیل ڈال کر جہاں چاہتا ہے لے جاتا ہے۔اُسکا نفس بھی اُسے نکیل ڈالے لئے پھرتا ہے۔پس اس کے لئے پہلے تو اجمالی اصولی علاج اور پھر تفصیلی اصولی علاج بیان کرتا ہوں۔مگر پیشتر اسکے کہ مَیں اس کے متعلق کچھ کہوں اس فلسفۂ اخلاق میں جو پہلے سمجھا جاتا تھا اور اس میں جو احمدی نقطۂ نگاہ سے اب سمجھا جاتا ہے فرق بتانا ضروری سمجھتا ہوں۔ مسلمانوں میں

فلسفۂ اخلاق کے بانی ابن مردویہؒ ہوئے ہیں۔ انہوں نے اس پر ایک کتاب لکھی ہے اور بعد میں ابن عربیؒ سب سے بڑے اُستاد سمجھے جاتے تھے۔ ان کے بعد امام غزالیؒ ہوئے جنہوں نے اخلاق پر ایک چار جلد کی کتاب لکھی ہے۔ ان کے بعد کوئی کتاب نہ لکھی گئی اور یہ سمجھ لیا گیا کہ فلسفۂ اخلاق ختم ہو گیا۔ اس وجہ سے مَیں اس کے متعلق روشنی ڈالنا چاہتا ہوں۔ تاکہ وہ لوگ جو اس فلسفہ کی کتابیں پڑھتے ہیں اُن پر وہ غلطیاں ظاہر ہو جائیں جو ان میں پائی جاتی ہیں۔ بے شک وہ باتیں اپنے وقت میں اچھی تھیں۔ مگر اب غلطیاں ہیں۔

امام غزالیؒ کے فلسفہ اور احمدی فلسفہ میں فرق یہ ہے کہ امام غزالیؒ نے صفاتِ سلبیہ پر بڑا زور دیا ہے۔ لیکن احمدی فلسفۂ اخلاق جو حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ السلام نے قائم کیا ہے۔ اس نے اس میں بڑا تغیر کر دیا ہے۔ کیونکہ آپ نے صفاتِ ایجابیہ پر زور دیا ہے۔ یعنی آپ نے یہ فرمایا ہے کہ اخلاق یہ نہیں کہ یہ نہ ہو وہ نہ ہو بلکہ یہ ہے کہ یہ بھی ہو اور وہ بھی ہو۔

اِس میں شبہ نہیں کہ نفس کُشی بھی علاج ہے مگر وہ ایک علاج ہے نہ کہ وہی علاج ہے ہم فلسفۂ اخلاق پر بحث کرتے ہوئے مندرجہ ذیل باتیں نہیں بھول سکتے۔ اوّل خدا تعالیٰ فرماتا ہے: **وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْنِ.** کہ ہم نے انسان کو صرف اس لئے پیدا کیا ہے کہ عبادت کرے۔ پھر فرماتا ہے۔ **وَاَمَّا الَّذِیْنَ سُعِدُوْا فَفِی الْجَنَّةِ خٰلِدِیْنَ فِیْهَا مَا دَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ اِلَّا مَاشَآءَ رَبُّکَ عَطَاءً غَیْرُ مَجْذُوْذٍ.** کہ انسان کو بھی ختم نہ ہونے والی نعماء کے لئے پیدا کیا گیا ہے۔

اِس سے معلوم ہوا کہ خدا تعالیٰ نے انسان کو اس لئے پیدا نہیں کیا کہ بعض باتیں نہ کرے بلکہ اس لئے پیدا کیا ہے کہ کرے۔ چنانچہ یہ نہیں فرمایا کہ ہم نے انسان کو اسلئے پیدا کیا ہے کہ فلاں کام نہ کرے۔ بلکہ یہ فرمایا کہ ہم نے اس لئے پیدا کیا ہے کہ عبادت کرے۔ پس ہم دنیا میں کام کرنے کے لئے پیدا کئے گئے ہیں۔ نہ اس لئے کہ کچھ نہ کریں۔ نفی بطور پرہیز کے ہوتی ہے۔ یعنی مقصد کے حصول میں جو روکیں ہیں اُنکو الگ کر دو۔ لیکن مقصد نفی نہیں؟ وہ غرض تو اس کے پیدا نہونے کی صورت میں زیادہ اچھی طرح پوری ہو رہی تھی۔ یہ غرض تو ایسی ہے جیسے ہندوؤں کے

خدا کی تعریف کہ وہ یہ بھی نہیں اور وہ بھی نہیں۔ خدا تعالیٰ نے انسان کو نفی کے لئے نہیں بلکہ اثبات کے لئے پیدا کیا ہے۔ گو نفی بطور پرہیز کے شامل ہو۔ پس اصل بحث یہ ہے کہ انسان کیا کیا بنے۔ نہ یہ کہ کیا کیا نہ بنے۔

دوسری بات جسے ہم نظر انداز نہیں کر سکتے یہ ہے کہ نفس کی مثال گھوڑے کی سی ہے بے شک گھوڑے کو ورزش کرانی چاہیئے اور اتنا دُبلا رکھنا چاہیئے کہ خواہ مخواہ سوار کو نہ گرا دے مگر کیا کوئی شخص ایسا بھی دیکھا گیا ہے کہ گھوڑے کو دُبلا کر کے سوار بن گیا ہو۔ ایک سفر میں ایک دوست جو سوار نہ تھے کہنے لگے۔ مَیں گھوڑے پر سوار نہیں ہونگا۔ اگر سوار کرانا ہے تو کوئی دُبلا گھوڑا لاؤ۔ اُن کے کہنے پر ایک دُبلا گھوڑا لایا گیا تو وہ اُس سے بھی خوف ہی ظاہر کرتے رہے اور کہنے لگے کہ کیا اس سے دُبلا اور چھوٹا کوئی گھوڑا نہیں؟ پس اگر سواری نہ آتی ہو تو گھوڑے کو دُبلا کرنے سے نہیں آسکتی۔ اسلئے نفس کو دُبلا کر کے یہ سمجھنا کہ ہم اس پر قابو پالیں گے اور پھر جس طرح چاہیں گے اُسے چلائیں گے ایک وہم ہے۔ صرف نفس کے دُبلا کرنے سے نہیں بلکہ اُس پر قابو پانے کا ہنر سیکھنے سے نفس پر قابو ہوگا۔

تیسری بات جسے ہم نظر انداز نہیں کر سکتے یہ ہے کہ گناہ نفس کے قبضہ میں آجانے سے ہی پیدا نہیں ہوتا بلکہ نفس کے مر جانے سے بھی پیدا ہوتا ہے۔ مثلاً بے غیرتی ہے۔ یہ نفس کے مر جانے کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے۔ ایسے موقعہ پر تو یہ ضرورت ہوتی ہے کہ نفس میں طاقت پیدا کی جائے۔ تا کہ وہ ایسے موقعہ پر کام کر سکے۔

غرض جس طرح کام لینے کے لئے گھوڑے کو کبھی دُبلا کیا جاتا ہے اور کبھی موٹا بھی یہی حالت نفس کی ہے۔ نہ تو اسے بالکل مار دینا چاہیئے اور نہ اتنا سرکش بنا دینا چاہیئے کہ کوئی بات ہی نہ مانے۔

فلسفۂ اخلاق کے متعلق غزالیؒ اور حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے بتائے ہوئے طریق میں یہ فرق بھی ہے کہ آپ نے یہ تعلیم دی ہے کہ ایمان کی بناء اجاء اور اُمید پر ہے۔ یہ تو قرآن کریم میں آتا ہے کہ طمع اور خوف کے درمیان ایمان ہوتا ہے۔ مگر یہ نہیں آتا کہ اُمید اور نا اُمیدی کے

درمیان ایمان ہوتا ہے۔ ناامیدی کے متعلق تو یہاں تک آیا ہے کہ اِنَّہٗ لَا یَیْئَسُ مِنْ رَوْحِ اللّٰہِ اِلَّا الْقَوْمُ الْکٰفِرُوْنَ کہ نا اُمید کافر ہی ہوتا ہے مومن نہیں ہوتا۔ تو ایمان کا فلسفہ اُمید پر قائم ہے اور حدیث میں آتا ہے۔ جیسا بندہ گمان کریگا ویسا ہی خدا تعالیٰ اس سے سلوک کریگا۔ پس ایسی کوئی ترکیب کہ جس سے نا اُمیدی پیدا ہوا اسلام نہیں کہلا سکتی۔ مگر خوف کے متعلق بھی یہ یاد رکھنا چاہئے کہ وہ طمع سے کم ہو اور طمع خوف کی نسبت زیادہ ہو بے شک خوف ایمان کا حصّہ ہے مگر طمع سے کم ہے۔ خدا تعالیٰ فرماتا ہے۔ رَحْمَتِیْ وَسِعَتْ کُلَّ شَیْءٍ کہ میری صفت رحمت غضب کی صفات سے زیادہ وسیع ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ بندہ کے دل میں بھی خوف سے طمع کی حالت زیادہ زور دار ہونی چاہئے۔

مومن کا دل امید سے پُر ہوتا ہے۔ بیشک اُسے خوف بھی ہوتا ہے مگر کم۔ وہ سمجھتا ہے خدا تعالیٰ مجھ سے ایسا معاملہ نہ کریگا کہ مَیں تباہ ہو جاؤں۔ اگر ہم مومن کے خوف اور امید کو دیکھیں تو صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اس کا خوف خدا تعالیٰ پر بدظنی کی وجہ سے نہیں ہوتا بلکہ اپنی کمزوری کی وجہ سے ہوتا ہے۔ لیکن اُس کی امید خدا تعالیٰ کے فضل کی وجہ سے ہوتی ہے۔ اب کیا یہ صحیح نہیں کہ ہماری کمزوری خدا تعالیٰ کے فضل کے مقابلہ میں حقیر ہے۔ پس اگر مومن کا خوف خدا تعالیٰ کی بے نیازی کو مدنظر رکھ کر ہو تو اس کی رحمت اس کی بے نیازی پر غالب ہے۔ اور اگر اپنی کمزوری کو دیکھ کر ہو تو خدا تعالیٰ کی طاقت ہماری کمزوری پر غالب ہے۔ پس بہر حال اُمید کا پہلو ہی غالب رہا کیونکہ اس کا محرک خوف کے محرک سے ہر طرح زبردست ہے۔

مگر یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ امید مطیع کے لئے ہوتی ہے باغی کے لئے نہیں ہوتی۔ کوئی انسان یہ نہ کہے کہ جو جی چاہے کرینگے اور پھر امید رکھیں گے کہ خدا کی رحمت کے مستحق ہو جائیں گے۔ یہ بغاوت ہے اور باغی کے لئے کوئی امید اور طمع نہیں ہو سکتی طمع مطیع کے لئے ہے۔

دوسری بات یہ یاد رکھنی چاہئے کہ مومن کے خوف کا موجب یہ نہیں ہوتا کہ شاید یہ بات نہیں ہو سکیگی یا یہ کہ ایسا نہ کیا تو سزا ملیگی بلکہ اُسے یہ خوف ہوتا ہے کہ جس رستہ پر مَیں چل رہا ہوں شاید اس پر چل کر نہ ہو سکے۔ اِسی طرح خوف کی وجہ یہ نہیں ہوتی کہ یہ بات نہ کی تو خدا تعالیٰ سزا دیگا

بلکہ یہ ہوتی ہے کہ شاید مَیں خدا تعالیٰ کی رحمت کو جذب نہ کرسکوں۔

غرض اصل اسلامی تصوف کی بنیاد طمع اور خوف پر ہے اور امید کا پہلو خوف کی نسبت بھاری ہے اور حق یہ ہے کہ اثباتی طاقتیں اُمید سے ہی پیدا ہوتی ہیں اور خوف سے سلبی طاقتیں پیدا ہوتی ہیں اصل مقصد خدا تعالیٰ سے محبت پیدا کرنا ہے اور وہ امید سے پیدا ہوتی ہے خوف سے صرف گناہ دور ہوتے ہیں۔

دیکھو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کس طرح اپنی امت سے خوف مٹانے کی کوشش فرمائی ہے۔ اوّل تو قرآن کریم میں رَحْمَتِیْ وَسِعَتْ کُلَّ شَیْءٍ آجانے سے معلوم ہو گیا ہے کہ خدا تعالیٰ کی رحمت ہر ایک چیز سے بڑھکر ہے۔ مگر رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے اس کی اور بھی وضاحت فرما دی۔ حدیث میں آتا ہے رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا۔ منذر خوابیں شیطانی ہوتی ہیں اور مبشر خوابیں خدا تعالیٰ کی طرف سے ہوتی ہیں۔ چونکہ خوابوں کا بہت بڑا اثر انسان کی طبیعت پر پڑتا ہے۔ اس لئے آپ نے یہ فرما دیا کہ منذر خوابوں سے خوف نہیں کھانا چاہئے یہ شیطان کی طرف سے ہوتی ہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ منذر خوابیں انبیاء کو بھی آتی ہیں۔ پس اس سے مُراد یہ نہیں کہ ہر منذر خواب شیطانی ہوتی ہے۔ بلکہ یہ مطلب ہے کہ اگر کثرت سے منذر خوابیں آئیں اور مبشر خواب آئے ہی نہیں یا کم آئے تو انہیں شیطانی خواب سمجھنا چاہئے۔ اس طرح آپ صلعم نے مومنوں کے دلوں سے خوف کو دور کر دیا ہے کیونکہ خوابوں کا اثر انسان کے دل پر خاص ہوتا ہے۔ لیکن چونکہ ہوسکتا ہے کہ ایسے شخص کو جسے شیطانی خوابیں آتی ہوں کوئی سچی خواب بھی آجائے اور وہ اس کو شیطانی سمجھ کر نقصان اٹھائے اس لئے اس کا بھی علاج بتا دیا کہ جب ڈراونی خواب آئے تو مومن کو چاہئے کہ بائیں طرف تھوک دے اور لاحول پڑھے۔ اِس میں کیا عجیب نکتہ آپ نے فرمایا ہے۔ لوگ کسی چیز کے متعلق کیوں تھوکتے ہیں۔ اسلئے کہ مَیں اسکی کوئی پرواہ نہیں کرتا۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے شیطانی خوابوں کے متعلق مومن کے نفس کو جرأت دلائی کہ جب اس قسم کی خواب آئے تو تھوک دو کہ ہم اس کی پرواہ نہیں کرتے اِس طریق سے آپ نے اُمید اور ہمت پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ دوسرا علاج لاحول پڑھنا فرمایا ہے کیونکہ جیسا کہ

اوپر بیان ہو چکا ہے احتمال ہے کہ ایسی خوابوں میں سے کوئی سچی بھی ہو۔ پس لاحول سے خدا تعالیٰ کے حضور میں استغفار اور اسکی ذات پر توکل کا مقام حاصل ہو جائیگا۔ غرض تھوکنے سے شیطانی خواب کے اثر سے محفوظ ہو جائیگا اور لاحول سے خدائی انذار کے اثر سے محفوظ ہو جائیگا۔ کیونکہ جو شخص خدا تعالیٰ کے آگے اپنے آپ کو ڈال دیتا ہے۔ وہ اس کی سزا سے بچ جاتا ہے۔ پس جو شخص یہ دونوں علاج کریگا اس کے دل پر سے خوف دور ہو جائیگا۔ دیکھو کس لطیف اور عمدہ صورت میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے اپنی اُمت پر سے خوف کے غلبہ کو دور کیا ہے۔

غزالی اور احمدی فلسفۂ اخلاق میں فرق بتا کر اب مَیں وہ علاج بتاتا ہوں جو اس روحانی مریض کے مناسب حال ہیں۔ جو عمل سے بالکل رہ گیا ہے اور باوجود کوشش کے کھڑا نہیں ہوسکتا۔ لیکن ان علاجوں کے بتانے سے پہلے میں اس شبہ کا ازالہ کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ ایسے انسان کے لئے کچھ اور عمل بنانے سے فائدہ کیا ہے کیونکہ یہ پہلے ہی فیصلہ ہو چکا ہے کہ اس سے عمل ہو ہی نہیں سکتا۔ ایسی صورتوں میں اور عمل بتانے سے کیا فائدہ ہوسکتا ہے؟ سو اس کا جواب یہ ہے۔ (۱) جب تک نیک عمل کرنا انسان کے لئے ناممکن نہ ہو جائے اس وقت تک عمل کے بغیر اس کے لئے کچھ نہیں ہوسکتا۔ ہاں اگر اس کے لئے عمل ناممکن ہو گیا ہو تو پھر بغیر عمل کے بھی پاکیزگی ہوسکتی ہے مگر جب تک عمل کرنا اس کے لئے ممکن ہے اسوقت تک عمل کے بغیر پاکیزگی نہیں ہوسکتی۔ پس اگر عمل ناممکن ہو جائے۔ جیسے کوئی پاگل ہے کہ وہ کوئی عمل نہیں کرسکتا تو اس کے متعلق رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا ہے۔ اُسے پھر موقعہ دیا جائیگا۔

ہاں یہ یاد رکھنا چاہئے کہ عمل دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک وہ جو ہر قسم کی حالت کے لوگوں کے لئے ممکن ہوتے ہیں۔ اور ایک وہ جو دل کی بعض حالتوں میں ناممکن ہوتے ہیں۔ جو عمل بعض قلبی حالتوں میں ناممکن ہو جاتے ہیں وہ جذبات سے اور خیالات سے تعلق رکھتے ہیں لیکن جو عمل کہ ظاہر سے تعلق رکھتے ہیں وہ کسی حالت میں بھی ناممکن ہوتے۔ مثلاً نماز ہے اس کے متعلق کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ مَیں نماز پڑھ سکتا ہی نہیں۔ اگر یہ کہہ سکتا ہے کہ ناجائز محبت میرے دل سے نہیں نکل سکتی۔ پس عمل دو قسم کے ہیں۔ ایک جذبات سے تعلق رکھنے والے۔ اور دوسرے وہ جن کا

تعلق جذبات سے نہیں ہوتا۔

اب دیکھو جسمانی بیماریوں کے علاج کس طرح کئے جاتے ہیں۔ اِسی طرح کہ ایک شخص ڈاکٹر کے پاس جاتا ہے۔ وہ بہت کمزور ہوتا ہے۔ کوئی کام نہیں کر سکتا۔ اُسے کہا جاتا ہے ورزش کیا کرو اب کیا وہ یہ کہتا ہے کہ مَیں تو پہلے ہی کام نہیں کر سکتا اور آپ کہتے ہیں ورزش کیا کرو۔ وہ یہ نہیں کہتا کیونکہ اور کام میں اور ڈاکٹر کے بتائے ہوئے کام میں فرق ہے۔ اور وہ یہ کہ جو کچھ ڈاکٹر بتاتا ہے گو وہ بھی کام ہے مگر ہے اختیار میں اور دوسرا اس کی طاقت سے بڑھ کر ہے۔ تو طاقت پیدا کرنے کے لئے بھی ایک عمل ہی کی ضرورت ہوتی ہے۔ ایک ایسا کمزور جو اُٹھ کر کھڑا بھی نہیں ہو سکتا۔ چارپائی پر لیٹا رہتا ہے۔ اس کے متعلق ڈاکٹر یہی کہے گا کہ اِسے مالش کیا کرو۔ جب اسے کچھ طاقت آئیگی تو بیٹھ سکیگا۔ پھر اور طاقت آئیگی تو کھڑا ہو سکے گا۔

یہی بات روحانی اعمال میں ہے کہ چھوٹے اعمال پر لگا کر اوپر اٹھایا جاتا ہے۔ ایک لڑکا جو کہتا ہو کہ مجھ سے دسویں جماعت کی ریڈر نہیں پڑھی جاتی اُسے کہا جائیگا اچھا نویں جماعت کی پڑھا کرو۔ اس کے متعلق وہ یہ نہیں کہہ سکتا کہ جب مجھ سے دسویں جماعت کی ریڈر نہیں پڑھی جا سکتی تو نویں کی کس طرح پڑھوں گا۔ اِسی طرح روحانیت میں چھوٹے اعمال سے ترقی کر کے بڑے اعمال تک لے جایا جاتا ہے۔

پہلے بیان شدہ علاجوں کے علاوہ ایسے شخص کے لئے بعض اور امور کی بھی ضرورت ہوتی ہے جنہیں میں آگے چل کر بیان کرونگا۔ پہلے علاج یہ ہیں:-

(۱) یہ کہ ایسا انسان نیکیوں اور بدیوں کا علم حاصل کرے۔

(۲) ان کے برمحل استعمال کا علم حاصل کرے۔

(۳) محاسبۂ نفس کرے۔

(۴) استغفار کثرت سے کرے۔

(۵) خدا تعالیٰ کی معرفت پیدا کرنے کی کوشش کرے۔ پہلے مَیں نے کہا تھا خدا کی معرفت پیدا کرے۔ مگر یہاں یہ کہتا ہوں کہ معرفت پیدا کرنیکی کوشش کرے۔ کیونکہ اسکی نسبت یہ فیصلہ ہو

چکا ہے کہ یہ عمل پر پوری طاقت نہیں رکھتا۔

(٦) نیکی اور بدی کا انجام سوچے۔

(٧) تَخَلَّقُوْا بِاَخْلَاقِ اللّٰهِ کی کوشش کرے۔

اِس سے آگے میں جو علاج بتاؤں گا وہ اصولی ہیں۔ ایسے انسان کے متعلق اس بات میں تو کوئی شک ہی نہیں کہ اس کے اندر بیماری ہے۔ اور بیماری کا علاج بغیر تشخیص کے نہیں ہوسکتا۔ اس لئے ضروری ہے کہ وہ علمی طور پر معلوم کرے کہ اُسے کیا بیماری ہے۔ اسکے لئے وہ پہلے اپنے دل سے یہ سوال کرے کہ وہ کس بات کے لئے کوشش کر رہا ہے؟ اس کا پہلا جواب یہ ہے کہ دل کی پاکیزگی کے لئے۔ اور دوسرا یہ کہ اعمال کی اصلاح کے لئے۔ امر اوّل خدا تعالیٰ کی محبت سے تعلق رکھتا ہے۔ اور دل کی کمزوری کے یہ معنی ہیں کہ صحیح محبت کا مادہ مفقود ہو گیا ہے۔ مَیں نے کئی دفعہ اپنی ایک رویاء سُنائی ہے کہ مَیں نے دیکھا حضرت مسیحؑ ایک چبوترہ پر کھڑے بچہ کی شکل میں آسمان کی طرف ہاتھ اٹھائے کھڑے تھے۔ اوپر سے مَیں نے حضرت مریم کو اُترتے دیکھا۔ وہ کچھ اونچے چبوترہ پر کھڑی ہو گئیں۔ پھر وہاں سے وہ ایک قدم نیچے اُتریں۔ اور حضرت مسیحؑ نے اوپر کی طرف قدم بڑھایا۔ حضرت مسیحؑ ان کی طرف جھکے۔ اور مریم اُن پر جھک گئیں۔ اس وقت میری زبان پر یہ الفاظ جاری ہو گئے Love creates love محبت محبت سے پیدا ہوتی ہے۔ پس محبت محبت سے ہی پیدا ہوتی ہے۔ مگر محبت پیدا کرنے کے لئے بھی سامان ہوتے ہیں اور وہ یہ ہیں۔ (۱) حسن (۲) احسان۔ اب ہم دیکھتے ہیں ایک شخص نے خدا تعالیٰ کا حسن بھی دیکھا یعنی اس کی صفات پر غور کیا۔ اور احسان بھی دیکھے۔ اپنے ساتھ خدا تعالیٰ کے تعلقات پر نظر کی۔ مگر باوجود اس کے اُس کے دل میں محبت نہ پیدا ہوئی۔ اس سے معلوم ہوا کہ اس کی حالت اس بچہ کی سی ہے جو اپنی ماں سے محبت نہیں کرتا اور محبت کا مادہ اُس میں سے مارا گیا ہے۔ جیسے اگر کسی انسان کے پیٹ میں نہ غذا جاتی ہے اور نہ دوا تو معلوم ہو جاتا ہے کہ اس کا معدہ خراب ہو گیا ہے۔ اس کے لئے پہلا کام یہ ہونا چاہئے کہ اسکے معدہ کو قوت دیں اور روحانیت میں یہ علاج ہے کہ اسکے احساسات اُبھاریں۔ سو ایسے انسان کے لئے پہلا علاج یہ ہے کہ چونکہ ظاہر کا اثر باطن پر ہوتا ہے

وہ ظاہری طور پر خشوع وخضوع اختیار کرے۔ نماز پڑھے تو رونے کی صورت بنائے خواہ تصنع سے ہی بنانی پڑے بعض کام اگر تصنّع اور بناوٹ سے بھی کئے جائیں تو اُن کا اثر باطن پر پڑتا ہے۔ میں نے امریکہ کی ایک کتاب میں پڑھا تھا۔ ایک پروفیسر طالب علمی کی حالت میں بہت قابل تھا آخر اُسے ایک کالج کا پرنسپل بنادیا گیا۔ مگر اسوقت وہ سخت ناقابل ثابت ہوا۔ اس نے اسکی وجہ ایک علم النفس کے ماہر سے پوچھی تو اس نے بتایا کہ تمہارے دل میں اتنی زیادہ نرمی ہے کہ اس کی وجہ سے تم انتظام نہیں قائم رکھ سکتے۔ اس کا اس نے علاج پوچھا تو اس نے بتایا کہ تم اپنے دانت اور جبڑے جوڑ کر رکھا کرو۔ بعض دفعہ منہ کو سختی سے بند کیا کرو۔ جس سے غصہ کی حالت نظر آئے اُس نے ایسا ہی کیا اور کچھ عرصہ کے بعد اُس میں ایسا تغیر پیدا ہوگیا کہ ملک میں مشہور ہوگیا کہ سب سے زیادہ سخت پرنسپل وہی ہے اور اس نے خوب انتظام کرلیا۔

تو ظاہر کا اثر باطن پر ہوتا ہے۔ وہ شخص جو بزدل ہو وہ اگر اکڑ کر چلے تو اس میں جرأت اور دلیری پیدا ہو جائیگی۔ فوج کے سپاہیوں سے ایسا ہی کرایا جاتا ہے۔ ان کو مشق کرائی جاتی ہے کہ اونچی گردن رکھ کر اور چھاتی تان کر چلیں۔ اس سے ان میں بہادری پیدا ہو جاتی ہے۔ پس پہلا علاج یہ ہے کہ کسی شخص میں جو عیب ہو اس کے مقابل کی صفت تصنّع سے اختیار کرے اسکا نتیجہ یہ ہوگا کہ اس میں فی الحقیقت وہ صفت پیدا ہو جائیگی۔ محبت کا مادہ پیدا کرنیکے لئے انسان ظاہری محبت کے آثار ظاہر کرے۔ مثلاً کسی سے مصافحہ کرے تو خوب بھینچ کر اور تپاک سے کرے۔ ایک شخص اس کے پاس آکر بیٹھے جب وہ اٹھنے لگے تو خواہ دل میں یہی چاہتا ہو کہ چلا جائے مگر اصرار کرے کہ اور بیٹھو۔ اس طرح جب وہ ظاہر میں محبت کے آثار ظاہر کریگا تو آہستہ آہستہ اس میں حقیقی محبت کا جذبہ پیدا ہو جائیگا۔ اور پھر وہ خدا تعالیٰ سے بھی محبت کرنے لگ جائیگا کیونکہ پہلے اس کے محبت نہ کرنے کی یہی وجہ تھی کہ اس میں محبت کا جذبہ ہی نہ تھا۔

(۲) اس کے علاوہ دوسرا علاج یہ ہے کہ ماں باپ۔ بیوی بچوں سے پیار میں زیادتی کرے یہی وہ نکتہ ہے جسے عشق مجازی کہا جاتا ہے۔ صوفیاء نے اسی کو عشق مجازی قرار دیا تھا کہ جن سے محبت کرنا جائز ہے اُن سے محبت میں زیادتی کی جائے مگر بعد میں اس کو بگاڑ کر کچھ کا کچھ بنالیا

گیا۔ عشق مجازی کے یہی معنی نہیں ہیں کہ ایک شخص کوئی خوبصورت لڑکا تلاش کرے۔ اس سے محبت کرنے لگ جائے یا اور اسی قسم کی ناجائز محبت میں گرفتار ہو جائے بلکہ یہ ہے کہ جن رشتہ داروں سے محبت کرنا جائز ہے اُن سے زیادہ محبت کرے۔ اس طرح اس میں محبت کا جذبہ زیادہ پیدا ہوگا اور پھر خدا تعالیٰ سے محبت کرنے کا جذبہ بڑھے گا۔

دوسری چیز جس کے لئے اپنی روحانیت کی اصلاح کی غرض سے انسان کوشش کرتا ہے وہ اعمال کی اصلاح ہے۔ اس کے لئے یاد رکھنا چاہئے کہ ایک عمل قوتِ ارادی سے ہوتا ہے۔ انسان ارادہ کرتا ہے کہ یوں کرنا ہے اور پھر کر لیتا ہے۔ لیکن جو شخص کہتا تو رہتا ہے کہ مَیں نے فلاں کام کرنا ہے مگر کر نہیں سکتا تو اُس کی اس بے بسی سے ثابت ہوتا ہے کہ اس میں یا تو (۱) اسکا قبضہ ارادہ پر نہیں رہا۔ انسان میں جو مَیں ہے وہ کمزور ہو گئی ہے اس وجہ سے وہ ارادہ پر حکومت نہیں کر سکتا۔ مَیں بطور مالک کے ہوتی ہے اور ارادہ بطور داروغہ کے۔ مالک کمزور ہو گیا ہے اور وہ داروغہ سے یہ نہیں کہہ سکتا کہ یہ کام کراؤ بلکہ اس سے ڈرتا ہے۔ اس وجہ سے داروغہ کام کرانے میں سست ہو جاتا ہے۔ (۲) یا پھر یہ کہ مَیں تو مضبوط ہے مگر داروغہ بیمار ہو گیا یعنی قوتِ ارادی کمزور ہو گئی اور اس کا جذبات پر قابو نہیں رہا۔ جذبات داروغہ یعنی قوتِ ارادی کے ماتحت بطور ملازم ہوتے ہیں۔ جب داروغہ بیمار ہو گیا تو ملازم سُست ہو گئے۔ اسکا حکم نہیں مانتے گویا اس طرح مَیں اور احساسات میں جو واسطہ تھا وہ کمزور ہو گیا۔

(۳) اگر یہ بھی نہیں تو یہ نقص پیدا ہو گیا ہے کہ کوئی ایسی چیز ارادہ اور احساسات کے درمیان آ گئی ہے کہ باوجود اس کے کہ ارادہ حکم دینے کی طاقت تو رکھتا ہے اور احساسات ماننے کے لئے بھی تیار ہیں مگر ان میں اتنا فاصلہ ہو گیا ہے۔ یا روک پیدا ہو گئی ہے کہ احساسات تک حکم نہیں پہنچتا۔

پس عملی گناہ یا نیکی میں کمی کے یہ تین سبب ہوتے ہیں یعنی (۱) انانیت کی کمزوری (۲) ارادہ کی کمزوری (۳) بعض اور چیزوں کی دخل اندازی احساسات کو ارادہ کے قبضہ سے نکال لیتی ہے جیسے مثلاً عادت ہے۔ ایک شخص کو حقہ پینے کی عادت ہے، وہ ارادہ رکھتا ہے کہ حقہ نہیں پینا۔ مگر

جب سامنے حقہ دیکھتا ہے تو کچھ نہیں کر سکتا اور عادت سے مجبور ہو کر پی لیتا ہے۔

اب مَیں وہ امور بتاتا ہوں جن سے انانیت بڑھتی ہے اور انسان کی قوت ارادی مضبوط ہوتی ہے۔(۱) پہلی چیز جو مَیں کو مضبوط کرتی ہے وہ قوتِ بقا یعنی قائم رہنے کی خواہش ہے۔ ہر چیز میں یہ خواہش پائی جاتی ہے کہ مجھے باقی رہنا چاہئے۔ایک معمولی سے کیڑے کو مارو۔تو وہ تلملاتا ہے۔ یہ اس بات کی علامت ہوتی ہے کہ وہ زندہ رہنا چاہتا ہے۔ وہ انسان جسمیں مذکورہ بیماریاں پیدا ہو جائیں اسے خیال کرنا چاہئے کہ اگر میری یہی حالت رہی تو مَیں مرا مگر تجھے تو زندہ رہنا ہے اس لئے قوت بقا کو مضبوط کرے۔ یہ ایک طبعی تقاضا ہے اور فکر سے جلدی بڑھ سکتا ہے۔ چنانچہ یہی دیکھ لو ایک حقہ پینے والا حقہ دیکھ کر اس کے پاس جا بیٹھیگا۔شراب پینے والا شراب دیکھ کر اُسکی طرف دوڑیگا۔لیکن اگر کوئی تلوار لیکر اُسے وہاں مارنے کے لئے آئے تو پھر دیکھو کس طرح بھاگتا ہے۔ کہتے ہیں شرابی کو اگر جوتیاں ماری جائیں تو اس کا نشہ دور ہو جاتا ہے۔ یہ بقا کی خواہش کا ہی غلبہ ہوتا ہے جس کے باعث نشہ دور ہو جاتا ہے۔ (۲) فنا کی خواہش کو مضبوط کرلے۔ یہ تقاضا پہلے تقاضا کا لازمی نتیجہ ہے۔ابقاء کی خواہش پوری نہیں ہوسکتی جب تک افناء کی خواہش کو مضبوط نہ کرے۔اُسے چاہئے کہ افناء کی خواہش کو بھی مضبوط کرے یعنی سوچے کہ جو چیز میرے مقاصد میں حائل ہوگی مَیں اس کو پیس ڈالوں گا۔

(۳) تیسرا ذریعہ انانیت کے بڑھانے کا جذب کی طاقت کو مضبوط کرنا ہے۔ ایسا انسان سوچے کہ جن چیزوں کی مجھے ضرورت ہے وہ مَیں ضرور لونگا جن جن چیزوں کا حاصل ہونا مشکل نظر آئے ان کے متعلق یہ احساس دل میں بار بار قائم کرے اس سے انانیت غالب آجائیگی۔

(۴) قوتِ مقابلہ کی طاقت کو مضبوط کرے۔یعنی یہ خیال کرے کہ جو چیزیں مضر ہونگی انکا مَیں مقابلہ کرونگا۔

(۵) استقلال کی طاقت کو مضبوط کرے۔ اس سے بھی مَیں پیدا ہوتی ہے۔ استقلال کبھی کبھی مشکل ہوتا ہے اور بعض کے لئے ناممکن ہوتا ہے مگر بعض لوگ اس کے متعلق بے توجہی کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں خیر اس بات کو جانے دو۔ یہ عادت نہ رہنی چاہئے۔ کیونکہ اگر انسان بعض باتوں

میں استقلال دکھائے تو دوسری باتوں میں استقلال کی قوت پیدا ہو جاتی ہے۔ اور اس طرح مَیں کی طاقت مضبوط ہو جاتی ہے۔

(٦) مصلحت- یہ بھی بقاء کے نتیجے میں پیدا ہوتی ہے۔ مصلحت وقت کو غور کر کے کام کرے۔ اِس سے تدبیر حکمت۔ راز رکھنے اور نفس پر قابو رکھنے کی قابلیت پیدا ہوگی اور انانیت ترقی کریگی۔

(٧) احتیاط ہوشیاری۔ چوکس رہنا دوراندیشی۔ ان باتوں کو ذہنی طور پر پیدا کرنیکی کوشش کرے۔ ان سے بھی انانیت ترقی کریگی۔

(٨) اپنی مدح سے نفرت کرے۔ اگر کوئی کرے تو اُسے روک دے۔ اس سے بھی انانیت مضبوط ہوتی ہے۔ مدح انانیت کو مار دیتی ہے اور نہایت تیز چھری ہے جو اُسے ذبح کر دیتی ہے۔ دیکھو قرآن کریم میں کیا لطیف طور پر بیان کیا گیا ہے۔ خدا تعالیٰ فرماتا ہے: وَيُحِبُّوْنَ اَنْ يُّحْمَدُوْا بِمَا لَمْ يَفْعَلُوْا (١٨٩:٣) کچھ ایسے لوگ ہیں جو یہ پسند کرتے ہیں کہ جو کام انہوں نے نہیں کیئے ان کے متعلق ان کی تعریف کی جائے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ایسے لوگ وہ بات مانتے ہیں جو لوگ ان کے متعلق کہیں اور خود اپنے نفس پر غور نہیں کرتے کہ انہوں نے کوئی کام کیا بھی ہے کہ نہیں یعنی ایسے لوگ خود کام نہیں کرتے۔ جو تھوڑا بہت کام ہو جائے اُسی پر خوش ہو جاتے ہیں۔ اور جو دوسرے بتائیں کہ تم نے یہ کام کیا ہے اسے مان لیتے ہیں کہ ہم نے ایسا ہی کیا ہے۔ گویا دوسروں کی مدح ان کے لئے جو خیالی محل بنا دیتی ہے اس میں ایسے لوگ رہتے ہیں۔ پس مدح سے نفرت کرنے سے انانیت مضبوط ہوتی ہے۔

(٩) نواں علاج عزتِ نفس کی طاقت کا پیدا کرنا ہے۔ یعنی انسان ہر قسم کی ذلّت اور شرمندگی کی برداشت سے انکار کرے۔ کہے میری طرف بدی کیوں منسوب ہو۔ اس طرح نفس کو غیرت آتی ہے اور وہ اُٹھ کھڑا ہوتا ہے۔ اور پھر ارادہ سے کام کرا لیتا ہے۔

(١٠) دسواں علاج وقار ہے یعنی جو باتیں تم سے متعلق نہ ہوں۔ ان میں خواہ مخواہ دخل نہ دو ہر کام میں دخل دینا چھچھورا پن ہوتا ہے اور اس سے انانیت مُردہ ہو جاتی ہے۔

(۱۱) گیارھواں علاج امید ہے۔ اس طاقت کو اپنے اندر بڑھاؤ۔ اس سے بھی اعزازِ نفس حاصل ہوتا ہے۔ انسان یقین رکھے کہ ایسا ہو جائیگا۔ اس طرح اپنے نفس پر اعتبار کرنے کی طاقت پیدا ہو جاتی ہے۔

(۱۲) بارھواں علاج خوش مزاجی ہے۔ اس سے انسان میں طاقت پیدا ہوتی ہے۔ اور کُڑھنے سے طاقت ضائع ہو جاتی ہے۔

اِن میں سے بہت سی باتیں ایسی ہیں جو مشکل ہیں لیکن اگر کوئی ان میں سے چند پر بھی عمل کریگا تو اس میں طاقت پیدا ہونی شروع ہو جائیگی۔ یہ سب امور ذہنی ہیں اور ان کی مشق سے انسان کی ذہنی قوتیں نشوونما پا سکتی ہیں یہاں تک کہ ارادہ ہی ماتحت آ جائے۔ ان کے استعمال کا بہتر طریق یہ ہے کہ انسان انسان کی اس حیثیت پر غور کرے جو مَیں نے بتائی ہے اور اس سے چند ہی دن میں علیٰ قدرِ مراتب وہ اپنے اندر انانیت کا جذبہ بڑھتا ہوا پائیگا۔

مگر کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ انانیت ہی حد سے بڑھ جاتی ہے اور اس سے گناہ پیدا ہونے لگتے ہیں۔ جیسے ایک ظالم آقا ہو جو خواہ مخواہ نوکروں کو مارتا رہتا ہو۔ ایسی حالت میں اسکا علاج خدا تعالیٰ کی بے نیازی پر غور کرنا ہے۔ انسان سوچے کہ اگر میری مَیں اس طرح ہر نقص پر گرفت کر رہی ہے تو اگر خدا تعالیٰ مجھ سے یہی سلوک کرے تو میری کیا حالت ہو اور یہ سوچے کہ مجھے جو کچھ ملا ہے وہ خدا تعالیٰ کا عطیہ ہے۔ مَیں اس کا مالک نہیں ہوں۔ مَیں تو صرف امین ہوں اور امانت کے متعلق سوال کیا جائیگا۔ اس لئے مجھے بے جا سختی نہیں کرنی چاہئے۔

جب انانیت پیدا ہو جائے یا وہ پہلے ہی موجود ہو مگر مشکل ارادے کے متعلق ہو یا درمیانی روکوں کے متعلق ہو تو اس صورت میں اس کا مندرجہ ذیل علاج ہے:

(۱) اوّل تو وہی ظاہر و باطن کی مشابہت پیدا کرنا ہے جو پہلے بیان کر آیا ہوں کہ ظاہری طور پر انسان تصنع سے ہی کام کرے اس کا اثر باطن پر پڑیگا۔ حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے اس پر خاص زور دیا ہے۔

(۲) دوسرا علاج کامل توجہ ہے۔ یہ گُر کامیابی کے لئے نہایت ضروری ہے۔ اسکا مطلب یہ

ہے کہ انسان خیالات کو ایک ہی رَو میں چلائے اور اپنے دل سے خدا تعالیٰ کے سوا باقی سب چیزوں کے خیالات مٹا دے۔ قرآن کریم میں آتا ہے وَالنّٰزِعٰتِ غَرْقًا جو لوگ کسی کام میں کامیاب ہونا چاہتے ہیں اس میں غرق ہو جاتے ہیں۔ گویا وہ اپنے خیالات کو اس طرح چلاتے ہیں کہ صرف وہی کام اُن کا مقصد رہ جاتا ہے اور کسی چیز کی انہیں فکر نہیں ہوتی۔ جب کسی کام کے متعلق نفس میں پورا پورا نقشہ کھنچ جاتا ہے تب اس میں کامیابی حاصل ہو سکتی ہے۔ مثلاً ایک شخص جسے جھوٹ بولنے کی عادت ہے وہ یہ خیال کرے کہ مجھے جھوٹ چھوڑ دینا چاہئے تو اس سے کامیابی نہ ہوگی جبتک رات دن اسکی توجہ اسی طرف نہ ہوگی کہ جھوٹ نہیں بولنا اور جھوٹ چھوڑ دینا ہے۔

ایک بات کا بار بار خیال کرنے سے یہ طاقت پیدا ہوتی ہے مگر اس طاقت کے متعلق خطرہ بھی ہوتا ہے۔ کیونکہ یہ پاگل ہو جاتی ہے یعنی ارادہ کے قبضہ سے نکل جاتی ہے اور اِدھر اُدھر ناچنے لگتی ہے۔ ہمارے ملک میں کئی لوگ پوچھا کرتے ہیں۔ نماز میں دلیلیں آتی ہیں ان کے دُور ہونیکا کوئی علاج بتائیے۔ دلیلیں آنیکا یہی مطلب ہے کہ ایسے شخص کی خیال کی طاقت پاگل ہوگئی ہے اسے توجہ تو پیدا ہوتی ہے مگر خدا تعالیٰ کی طرف نہیں بلکہ اور چیزوں کی طرف۔ وہ خدا تعالیٰ کی طرف لگاتا ہے وہ کہیں اور بھاگ جاتی ہے۔ پس جن لوگوں کو نماز میں دلیلیں آتی ہوں ان کے متعلق یہ خیال غلط ہے کہ انہیں توجہ نہیں پیدا ہوتی۔ اصل بات یہ ہے کہ اُن کی توجہ قوت ارادی کے قبضہ میں نہیں ہوتی خود مختار ہو جاتی ہے اور جدھر چاہتی ہے چلی جاتی ہے۔

ایسی حالت میں اس کو قوت ارادی کے ماتحت رکھنے کی کوشش کرنا چاہئے۔ نماز میں جو شخص اور خیالات میں پڑ جاتا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کی وجہ ارادہ کی قوت کے قبضہ سے نکل گئی ہے۔ اس صورت میں سب سے پہلا کام اُسے قوتِ ارادی کے ماتحت لانا ہے۔ اب سوال ہوتا ہے کہ اُسے کس طرح ماتحت لائیں؟ اس کا اصل جواب تو میں آگے چل کر دونگا لیکن ایک اور نسخہ بتاتا ہوں اور وہ یہ کہ اگر ایسے لوگ نماز میں اس امر کا خیال کرنا چھوڑ دیں کہ زور سے توجہ قائم کریں تو پھر ان کی یہ حالت نہ ہوگی۔ معمولی باتوں کی طرح نماز بھی پڑھیں۔

(۳) تیسری چیز قوتِ ارادی کا استعمال ہے۔ ارادہ کرے کہ مَیں اس کام کو کرتا ہی جاؤنگا اور کسی روک کی پرواہ نہیں کرونگا۔ بعض دفعہ چونکہ قوت ارادی کمزور ہوتی ہے اس لئے ایک کام کا انسان ارادہ کرتا ہے۔ مگر پھر گر جاتا ہے۔ اس لئے مَیں قوتِ ارادی کو مضبوط اور طاقتور بنانے کے لئے ایک نسخہ تجویز کرتا ہوں جس میں تیرہ دوائیں پڑتی ہیں۔ اور وہ دوائیں قرآن کریم اور احایث سے ملتی ہیں۔

(۱) اوّل یہ کہ اس آیت کو انسان ورد میں لائے۔ **وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنَ**. خدا تعالیٰ فرماتا ہے۔ مَیں نے انسان کو صرف عبادت کے لئے پیدا کیا ہے یعنی اپنا بندہ بننے کے لئے پیدا کیا ہے۔ انسان اس بات کا خیال کرے اور کہے کہ مجھے اللہ تعالیٰ نے اپنے قرب کے لئے پیدا کیا ہے اور خدا تعالیٰ کی پیدائش رائیگاں نہیں جاسکتی۔ مَیں ضرور اس کا عبد بنونگا اور ہو نہیں سکتا کہ نہ بنوں۔ وہ یہ خیال نہ کرے کہ مجھ سے کچھ نہیں ہوسکتا۔ مَیں کچھ نہیں کرسکتا بلکہ وہ اس طرح نقشہ جمائے اور اس طرح تصور باندھے کہ گویا خدا تعالیٰ نے اسے پکڑ کر کہا ہے کہ اُٹھ کام کر۔ یہ وہی بات ہے جسے صوفیا مراقبہ کہتے ہیں۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ انسان گردن ڈال کر بیٹھا رہے بلکہ یہ ہے کہ بار بار سوچے اور غور کرے کہ بھلا کبھی یہ ہوسکتا ہے کہ خدا تعالیٰ مجھے عبد بننے کے لئے پیدا کرے اور مَیں کچھ اور بن جاؤں۔

(۲) اس آیت کے مضمون پر غور کرے کہ **لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِيْ اَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ** خدا تعالیٰ نے مجھے بہترین طاقتیں دیکر بھیجا ہے جو نیکی بھی انسان کے لئے ممکن ہے وہ میرے لئے بھی ممکن ہے۔ اور جو بھی اعلیٰ درجہ حاصل ہونا ممکن ہے وہ میرے لئے بھی ممکن ہے۔ پھر میں کس طرح گرسکتا ہوں۔ اس بات کا بھی خوب نقشہ جمائے اور بار بار اس پر غور کرے۔

(۳) تیسرے اس آیت کا ورد کرے **نَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيْد**. اور اس رنگ میں اس کا مفہوم سوچے اور اسے ذہن میں نقش کرے کہ مجھے خدا تعالیٰ نے پیدا کیا ہے اور وہ ان باریک در باریک وساوس کو جانتا ہے جو دل میں پیدا ہوتے ہیں اور دل کو پراگندہ کرسکتے ہیں حتّٰی کہ وہ انسان کے نفس سے بھی زیادہ اس کے قریب ہے۔ نفس جب وسوسے پیدا کرتا ہے وہ جھٹ

اسکو مٹا سکتا ہے۔ یہی بات خدا تعالیٰ نے اس آیت میں بیان کی ہے۔ اور بندہ کو تسلی دی ہے کہ خوف کی کیا وجہ ہے جبکہ وسوسوں کے سامان سے زیادہ قریب وسوسے مٹانے کے سامان ہیں۔

(۴) اس آیت پر غور کرے وَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُوْلِهٖ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ وَلٰكِنَّ الْمُنَافِقِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ. اس کے متعلق اس طرح سوچے کہ میں مومن ہوں اور مومن کسی سے مغلوب نہیں ہو سکتا۔ پھر کس طرح ہوسکتا ہے کہ میری قوت ارادہ غالب نہ آئے۔ اسے اسقدر دوہرائے کہ قوتِ ارادہ نفس پر غالب آجائے۔

(۵) یہ آیت پڑھا کرے اِنَّ عِبَادِيْ لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطَانٌ. یعنی خدا تعالیٰ فرماتا ہے میرے بندوں پر شیطان کا قبضہ نہیں ہے۔ وہ سوچے مَیں خدا تعالیٰ کا بندہ ہوں اور خدا کے بندوں پر شیطان کا تسلّط نہیں ہوسکتا۔ پھر کس طرح ہوسکتا ہے کہ بدی مجھ پر غالب آجائے۔

(۶) یہ آیت پڑھے لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ. اور یہ خیال کرے کہ مَیں خدا تعالیٰ کے سوا کسی سے نہیں ڈرتا۔ مَیں مومن ہوں اور مومن کو سوائے خدا کے کسی کا خوف نہیں ہو سکتا۔

(۷) اس آیت پر غور کرے نَحْنُ اَوْلِيٰٓئُكُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِي الْاٰخِرَةِ. جو مومن ہوتا ہے اس پر فرشتے نازل ہوتے ہیں اور کہتے ہیں ہم تمہارے مددگار ہیں۔ پھر تم کیوں گھبراتے ہو۔

(۸) آیت وَلَا تَايْئَسُوْا مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ اِنَّهٗ لَا يَيْئَسُ مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ اِلَّا الْقَوْمُ الْكٰفِرُوْنَ پڑھے اور سوچے مَیں مشکلات سے مایوس نہیں ہوسکتا۔ مایوسی موت ہے جسے قبول کرنے کے لئے مَیں تیار نہیں ہوں۔ اگر ارادہ نہیں مانتا تو مَیں اسے سیدھا کر کے چھوڑ دونگا۔

(۹) یہ آیت زیرِ غور رکھے يٰٓاَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ارْجِعِيْٓ اِلٰى رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً فَادْخُلِيْ فِيْ عِبَادِيْ وَادْخُلِيْ جَنَّتِيْ مَیں مطمئن ہوں اور غیر محدود امیدیں میرے سامنے کھڑی ہیں۔ پھر مجھے کیا گھبراہٹ ہوسکتی ہے جبکہ خدا تعالیٰ میرے ساتھ ہے اور فرماتا ہے۔ جا اس جنت میں داخل ہو جا جو کبھی برباد نہیں ہوسکتی۔

(۱۰) حدیث یُوْضَعُ لَهُ الْقُبُوْلُ زیرِ نظر رہنی چاہئے۔ اور سوچنا چاہئے کہ مومن کے متعلق تو اللہ تعالیٰ وعدہ کرتا ہے کہ اس کی قبولیت دنیا میں پھیلائی جائیگی اور وہ ذلیل نہیں ہوگا۔ اِس سے بھی قوت ارادی بڑھتی ہے۔

(۱۱) وَسَخَّرَ لَكُمْ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا مِّنْهُ اِنَّ فِيْ ذَالِكَ لَاٰيَاتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ کی آیت پر غور کرتا ہوا یہ خیال کرے کہ سب ناکامیاں لالچ اور حرص سے پیدا ہوتی ہیں۔ مگر مجھے کسی چیز کی حرص نہیں ہے۔ کیا پہلے ہی خدا تعالیٰ نے میرے لئے سب کچھ نہیں بنا چھوڑا؟

(۱۲) مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ. اس میں یہ سوچے کہ بدخیال بدارادے اور بدتحریکیں میرے دل میں ہرگز داخل نہیں ہوسکتیں کیونکہ مَیں اس امت میں سے ہوں جس کے متعلق خدا تعالیٰ فرماتا ہے۔ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ کہ وہ کافروں کا اثر قبول نہیں کرتے بلکہ مومنوں کا اثر قبول کرتے ہیں۔

(۱۳) كُوْنُوْا مَعَ الصَّادِقِيْنَ کا ورد کرے اور اس حدیث کو سوچے لَا يَشْقٰى جَلِيْسُهُمْ وہ یہ خیال کرے کہ جو نیک ارادے میرے دل میں پیدا ہوتے ہیں وہ دوسروں پر اثر کرتے ہیں۔ خدا تعالیٰ فرماتا ہے نیکوں کے پاس جاؤ۔ اگر میرا کسی پر اثر نہیں ہوتا تو پھر میں مومن نہیں ہوسکتا۔

(۱۴) اس بات پر غور کرے کہ خدا تعالیٰ نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے متعلق فرمایا ہے۔ وَمَا جَعَلْنَا لِبَشَرٍ مِّنْ قَبْلِكَ الْخُلْدَ اَفَاِنْ مِّتَّ فَهُمُ الْخٰلِدُوْنَ ہم نے نہ تجھے اور نہ کسی اور انسان کو ہمیشہ اس دنیا میں رہنے کے لئے بنایا ہے۔ انسان خیال کرے کہ جب مجھے ہمیشہ اس دنیا میں نہیں رہنا تو مجھے اپنے وقت کو ضائع نہیں کرنا چاہئے۔

اِن چودہ باتوں سے قوتِ ارادی کو وہ طاقت حاصل ہو جاتی ہے کہ وہ جذبات اور احساسات کو دبالیتی ہے۔ مگر شرط یہ ہے کہ انسان ان باتوں پر پورے طور پر غور وفکر کرے۔

(۴) چوتھا علاج ارادے کو مضبوط کرنے یا اس کے راستہ سے روکیں دُور کرنیکا یہ ہے کہ جس عیب کو دور کرنا ہو۔ اس پر شروع دن سے ہی یکدم حملہ کردے۔ جب فوج کسی مقام پر حملہ

کرتی ہے تو پہلے حملہ میں سارا زور صرف کر دیتی ہے۔اسی طرح کسی بدی کے دور کرنے کے متعلق کرنا چاہئے۔یعنی جس بدی کو دُور کرنا مدّ نظر ہو اس پر پورا زور صرف کرنا چاہئے۔

(۵) پانچواں علاج یہ ہے کہ جو نیک خصلت پیدا کرنی ہو اس کی عادت ڈالے یا جس خصلت کو چھوڑنا چاہے اُس کے اُلٹ عادت ڈالے۔ مثلاً اگر غصہ پیدا ہو تو نرمی کی عادت ڈالے۔

(۶) فکر اور تأنّی کی عادت ڈالے۔جلد بازی سے بچے۔اس سے جو عادات پہلے پڑ چکی ہونگی انکے حملہ سے محفوظ ہو جائیگا۔ کیونکہ عادات جلد بازی سے فائدہ اُٹھا کر ہی حملہ کرتی ہیں اور سوچ کے اور غور کر کے کام کرنے پر وہ حملہ نہیں کرسکتیں۔

(۷) جس بات کے کرنے یا چھوڑنے کا ارادہ کرے اس کی پوری حقیقت کو اپنے ذہن میں لانے کی کوشش کرے اور اس کے تمام پہلوؤں پر غور کرے۔ یہاں تک کہ اس کا ایک مکمل نقشہ اس کے ذہن میں قائم ہو جائے۔اس کا یہ نتیجہ ہوگا کہ جو کام کرنیکا ہوگا اُسے یہ آسانی سے کر سکے گا اور جو چھوڑنے کا ہوگا اُسے آسانی سے چھوڑ سکیگا۔

(۸) جو باتیں جائز ہوں اُن کی طرف اُسے رغبت ہو۔انہیں بعض موقعوں پر ترک کر دے، تا کہ مرضی کے خلاف کام کرنے کی اُسے عادت پڑے۔مثلاً ایک شخص کو چوری کی عادت ہوگئی ہے اور دور نہیں ہوتی تو اُسے چاہئے کہ بعض جائز باتیں جن کی طرف اُسے رغبت ہے انہیں چھوڑنا شروع کر دے۔مثلاً ایک وقت دل سونے کو چاہتا ہے اور نہ سوئے۔ایک چیز کے کھانے کو چاہتا ہو اور یہ نہ کھائے۔اس طرح دل کو طاقت حاصل ہوتی چلی جائیگی۔حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ایک قول ہے مَیں اس کا یہی مطلب سمجھتا ہوں۔فرماتے ہیں عَرَفْتُ رَبِّیْ بِفَسْخِ الْعَزَائم کہ مَیں نے خدا تعالیٰ کو پختہ ارادوں کے بار بار ٹوٹنے سے پہچانا ہے۔اس کا مطلب یہی ہے کہ مَیں نے بعض ارادے کئے جو ٹوٹے۔مَیں نے پھر کئے پھر ٹوٹے لیکن جب مَیں نے بار بار ارادوں کے ٹوٹنے کے باوجود ان کا کرنا نہ چھوڑا اور ہمت نہ ہاری تو مجھے خدا تعالیٰ مل گیا۔ پہلے ہی اگر مَیں ارادہ کے ٹوٹ جانے پر نا اُمید ہو کر بیٹھ رہتا اور پھر عزم نہ کرتا تو مَیں خدا تعالیٰ کے پانے میں

ناکام رہتا۔

(۹) انسان اپنے نفس کا بار بار مطالعہ کرے جس طرح ایک حکیم مریض کو بار بار دیکھتا ہے۔ اِسی طرح وہ اپنے نفس کو دیکھے۔

(۱۰) مقصد بلند رکھے۔ درمیانی حالت پر قانع نہ ہو جائے۔ جو چیز لینا چاہتا ہے اس کی انتہائی حد مدّ نظر رکھے۔ جو شخص انتہائی درجہ کا ارادہ رکھتا ہے اُسے کچھ نہ کچھ مل جاتا ہے اس طرح انسان اپنے نفس پر قابو پا جاتا ہے۔

اس کوشش کے علاوہ ایک اور گُر ہے اور وہ دُعا کا گُر ہے جب انسان سے اپنی کوششوں کے ذریعہ کچھ نہ بنے تو اُسے بیرونی مدد کی ضرورت ہوتی ہے۔ پہلی چیز اپنی کوشش ہوتی ہے جو اندرونی امداد ہوتی ہے اور دوسری بیرونی امداد ہوتی ہے۔ انسان اپنی طرف سے کوشش کرے اور ساتھ ہی خدا تعالیٰ سے دُعا کرے کہ مجھ سے تو جو کچھ ہو سکتا ہے کر رہا ہوں۔ اب آپ ہی مدد دیں تو کامیاب ہو سکتا ہوں۔ ایک بزرگ کا قصہ مشہور ہے۔ ان کا ایک شاگرد تھا جسے تصوف کا بہت شوق تھا وہ اس کے سیکھنے کے لئے بہت عرصہ انکے پاس رہا۔ جب وہ واپس جانے لگا تو ان بزرگ نے پوچھا۔ کیا تمہارے وطن میں شیطان ہوتا ہے؟ وہ حیران ہو کر کہنے لگا۔ شیطان کہاں نہیں ہوتا۔ بزرگ نے کہا جب تم اپنے وطن پہنچو گے تو اگر شیطان نے تم پر حملہ کیا تو کیا کرو گے؟ اس نے کہا مَیں شیطان کا مقابلہ کرونگا۔ بزرگ نے کہا۔ اچھا تم نے شیطان کا مقابلہ کیا اور وہ بھاگ گیا۔ لیکن پھر تم خدا تعالیٰ کی طرف متوجہ ہونے لگے اور اُس نے پیچھے سے آ پکڑا تو کیا کرو گے؟ اُس نے کہا مَیں پھر اسکا مقابلہ کرونگا۔ بزرگ نے کہا اگر تم اسی طرح شیطان کا مقابلہ کرتے رہو گے تو خدا تعالیٰ کی طرف کس طرح متوجہ ہو سکو گے؟ اس نے کہا تو پھر آپ ہی بتائیں مجھے کیا کرنا چاہیئے؟ انہوں نے کہا بتاؤ اگر تم کسی دوست کو ملنے جاؤ جس کا ایک کتا ہو جو تمہیں گھیر لے تو کیا کرو گے؟ اُس نے کہا مَیں اُسے لاٹھی مارونگا۔ انہوں نے کہا کُتا بھاگ کر پھر تمہارے پیچھے آ پڑا تو کیا کرو گے؟ اُس نے کہا صاحب مکاں کو آواز دونگا کہ آؤ اور آ کر اپنے کُتے کو روکو۔ انہوں نے کہا یہی طریق شیطان کے متعلق اختیار کرنا خدا تعالیٰ سے کہنا مَیں آپ کے پاس آنا چاہتا

ہوں۔مگر شیطان مجھے آنے نہیں دیتا۔آپ ہی اسکو دور کریں پس برائیوں سے بچنے کا ایک ذریعہ یہ بھی ہے کہ انسان دُعا کرے کہ الٰہی میں اپنی طرف سے کوشش کرتا ہوں۔آگے مدد آپ نے دینی ہے۔

دسویں بات مَیں نے یہ بیان کی تھی کہ انسان اپنا مقصد بلند رکھے۔ایک دوست نے اسکے متعلق سوال کیا ہے کہ کیا بلند خواہشات بھی جائز ہیں؟ میرے نزدیک یہ جائز نہیں اور حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے بھی لکھا ہے کہ الہام کی خواہش نہیں کرنی چاہیئے۔مگر مقاصد کے بلند ہونے اور کسی بات کی طمع اور حرص میں بڑا فرق ہے۔حرص کا مفہوم یہ ہے کہ انسان جو چیز اچھی دیکھے اسی کے متعلق خواہش کرے کہ مل جائے۔لیکن مقصد وہ ہوتا ہے جو پہلے مقرر کرلیا جاتا ہے۔ اور پھر اس کے حصول کی کوشش کی جاتی ہے۔گویا حریص تو سوالی بنتا ہے۔لیکن مقصد کے حصول کے لئے کوشش کرنیوالا علو ہمت والا بنتا ہے۔

اسی طرح الہام کی خواہش کا حال ہے۔الہام دعوت ہے جو خدا تعالیٰ اپنے کسی بندے کو دیتا ہے اب اگر کوئی کہے میں فلاں دوست سے اسلئے ملنے جاتا ہوں کہ اس کے ہاں مکلّف دعوت کھاؤں تو یہ کیسی کمینہ بات ہوگی اور سب لوگ اُسے بُرا سمجھیں گے۔لیکن اگر کوئی کہے مَیں فلاں دوست سے ملاقات کرنے کے لئے جاتا ہوں تو خواہ اُسے کتنی مکلّف دعوت ملے۔اُسے کوئی بُرا نہ کہیگا۔اسی طرح الہام کی خواہش کا حال ہے۔جب کوئی دُعا کریگا کہ خدا تعالیٰ مجھے اعلیٰ مقام پر پہنچادے اور اپنا قرب عطا فرمائے تو اس مقام کے حاصل ہوتے ہی اُسے الہام کی دعوت حاصل ہوجائیگی۔لیکن اگر کوئی یہ خواہش کرے کہ مجھے الہام ہو تو اس کے یہ معنی ہوں گے وہ اس دعوت کے حصول کا خواہشمند ہے۔خدا تعالیٰ کے قرب کی اسے کوئی پروا نہیں ہے۔اس وجہ سے الہام کی خواہش کرنا درست نہیں ہے۔

اَب مَیں پھر اصل مضمون کی طرف آتا ہوں۔یہ اصول جو مَیں نے بیان کئے ہیں اگر ان پر عمل کرنے کے باوجود نیک اعمال میں ترقی نہ ہو اور برائیوں سے انسان بچ نہ سکے تو سمجھنا چاہیئے اسے روحانی بیماری نہیں بلکہ جسمانی بیماری ہے۔اسکے اعصاب میں نقص ہے۔ایسی حالت میں

اسے ڈاکٹروں سے مشورہ لینا چاہئے۔ اور اگر یہ بات میسر نہ ہو۔ تو یہ چار باتیں کرے (۱) ورزش کرے۔ (۲) دماغی کام چھوڑ دے۔ (۳) عمدہ غذا کھائے۔ (۴) اپنا دل خوش رکھنے کی کوشش کرے۔

یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ بسا اوقات امراض روحانی وہم سے بھی پیدا ہو جاتے ہیں۔ جیسے وہم سے جسمانی بیماریاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ ایسے ہی وہم سے روحانی بیماریاں بھی لگ جاتی ہیں۔ میرا اپنا ہی تجربہ ہے۔ جب میں طب پڑھنے لگا تو جو بیماری پڑھتا تھا اس کے متعلق خیال ہوتا تھا کہ یہ تو مجھ میں بھی ہے۔ مَیں یہ خیال کرتا تھا کہ شاید یہ میرا ہی حال ہوگا۔ لیکن ایک ڈاکٹری کے طالبعلم نے مجھے بتایا کہ اُن کے استاد نے جماعت کو نصیحت کی تھی کہ طلباء کو اس قسم کا وہم ہوا کرتا ہے انہیں اس میں مبتلا نہیں ہونا چاہئے۔ اس لئے مَیں آپ لوگوں کو بھی نصیحت کرتا ہوں کہ ایسا نہ ہو۔ روحانی بیماریوں کا خیال کر کے یہ سمجھنے لگ جاؤ کہ یہ ہم میں بھی ہے اور اس طرح خواہ مخواہ اپنے آپ کو ان بیماریوں میں مبتلا کر لو۔ سُنا ہے ایک اُستاد تھا جو لڑکوں پر بڑا ظلم کرتا تھا۔ ایک دن لڑکوں نے ارادہ کیا کسی طرح چھٹی لینی چاہئے۔ ایک لڑکے نے کہا اگر میرا ساتھ دو تو مَیں چھٹی لے دیتا ہوں۔ مَیں جا کر کہونگا اُستاد جی آپ کو آج کیا ہوا ہے آپ کا چہرہ زرد معلوم ہوتا ہے۔ پھر تم آنا اور میری تائید کرنا۔ لڑکوں نے یہ تجویز مان لی۔ اس پر اُس لڑکے نے جا کر کہا۔ اُستاد جی خیریت ہے؟ اُستاد نے کہا کیا بکتا ہے اپنا کام کرو۔ اس نے کہا آپ کا چہرہ زرد معلوم ہوتا ہے۔ اس پر اُستاد نے اسے گالیاں دیں۔ اور دوسرا ایک اور آ گیا۔ اُس نے آ کر بھی یہی کہا۔ اُسے بھی گالیاں دیں۔ مگر پہلے کی نسبت کم۔ آخر لڑکوں نے باری باری آنا اور یہی کہنا شروع کیا۔ چھٹے ساتویں لڑکے تک اُستاد جی نے اِتنا مان لیا کہ ذرا طبیعت خراب ہے۔ تم تو یونہی پیچھے پڑ گئے ہو۔ جب پندرہ سولہ لڑکوں نے کہا تو اُستاد جی کہنے لگا۔ کچھ حرارت سی محسوس ہوتی ہے۔ اچھا لیٹ جاتا ہوں۔ یہ خیال کرتے کرتے اس کو بخار ہو گیا۔ اور لڑکوں کو چھٹی دے کر گھر چلا گیا۔ لڑکوں نے گھر جا کر اپنی ماؤں سے کہا کہ اُستاد جی بیمار ہو گئے ہیں ان کی عیادت کرنی چاہئے۔ جب عورتیں ان کے گھر جانے لگیں اور اظہارِ ہمدری کرنے لگیں تو اُس نے سمجھا مَیں تو بہت سخت بیمار ہوں۔ آخر

اُسی بیماری میں وہ مر گیا۔

یہ تو ایک لطیفہ ہے مگر یورپ میں تحقیقات کی گئی ہیں کہ جب سے پیٹنٹ ادویات نکلی ہیں امراض بڑھ گئی ہیں۔ ان دوائیوں کے اشتہار میں مشتہرین اس قدر مبالغہ کرتے ہیں کہ ساری مرضیں لکھ کر لکھ دیتے ہیں کہ یہ دوا ان سب بیماریوں کے لئے مفید ہے۔ پڑھنے والے کسی نہ کسی مرض میں اپنے آپ کو مبتلا سمجھ کر منگوا لیتے ہیں اور پھر ان کا وہم ترقی کرتا کرتا فی الحقیقت انہیں بیمار بنا دیتا ہے۔ پس وہم میں بھی نہیں پڑنا چاہئے۔

دوسری بات یہ سمجھ لو جو قومی طور پر بھی ضروری ہے کہ اشاعت فاحشہ نہ ہو۔ کئی لوگوں کی عادت ہوتی ہے کہ وہ خواہ مخواہ لوگوں کو بدنام کرنے کے لئے کہنا شروع کر دیتے ہیں۔ یہاں کے سب لوگ بد معاش اور دوسروں کا حق مارنے والے ہیں۔ پہلے تو کچھ لوگ اسکے خلاف آواز اٹھانے والے بھی ہوتے ہیں مگر پھر وہ بھی یہ کہنے لگ جاتے ہیں کہ اگر ایسے لوگ ہیں تو اپنے گھر میں ہیں ہمیں ان سے کیا۔ پھر اس سے آگے بڑھتے ہیں اور یہ کہتے ہیں ایسے لوگ ہیں تو سہی مگر ہم کیا کریں۔ پھر آہستہ آہستہ یہاں تک نوبت پہنچ جاتی ہے کہ وہ بھی کہنے لگ جاتے ہیں کہ سب لوگ بد معاملہ اور بد معاش ہو گئے ہیں۔ ایسے لوگوں کی بات پر کان نہیں دھرنا چاہئے۔ ورنہ خود بھی انسان اس بُرائی میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے۔ جو شخص کسی پر الزام لگاتا ہے وہ خود ایسا ہی ہو جاتا ہے۔ اس طرح قومیں برباد ہو جاتی ہیں۔ اسلئے جو شخص فواحش کی اشاعت کرے اسکا مقابلہ کرنا چاہئے۔ اور اس سے مطالبہ کرنا چاہئے کہ جو بُرا ہے اس کا نام لو عام بات کیوں کہتے ہو کہ سب لوگ ایسے ہو گئے ہیں جو بُرا ہے اس کا نام بتاؤ اور جس بُرائی میں وہ مبتلا ہے وہ بھی بتاؤ۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں جو قوم کے متعلق کہتا ہے کہ بد ہو گئی وہی شخص انکو بدکار بنا دیگا۔ یعنی لوگوں کو کہنا کہ ہماری قوم بُری ہو گئی یہ خیال قوم کو ویسا ہی بنا دیگا۔ تو ہمیشہ ایسے قومی دشمن کا مقابلہ کرنا چاہئے جو فحش کی اشاعت کرتا اور قوم کو بُرا کہتا ہو۔ لیکن اس کے ساتھ ہی میں یہ بھی کہتا ہوں کہ جو قوم نڈر ہو جاتی ہے وہ بھی تباہ ہو جاتی ہے۔ اسلئے اصل علاج یہ ہے کہ ایسے ہر امر کو جو کسی کی بُرائی کے متعلق ہو اسے اولوالامر تک پہنچانا چاہئے تا کہ وہ اس

کی تحقیقات کرے اور پھر اگر وہ نقص ٹھیک ہو تو اس کی اصلاح کی کوشش کرے۔

اس لیکچر کے متعلق میرا اندازہ تھا کہ ایک دن میں ختم ہو جائیگا لیکن جب مَیں نے اسکے نوٹ لکھے تو دو دن میں ختم ہو جانے کا خیال تھا۔ لیکن ابھی اصولی چالیس گُر باقی ہیں جو مَیں بیان نہیں کر سکا۔ اللہ تعالیٰ نے توفیق دی تو کتاب میں لکھ دیئے جائیں گے یا کسی اور موقع پر بیانکر دیئے جائیں گے۔ چالیس گُر ابھی ایسے باقی ہیں جن سے معلوم ہوسکتا کہ انسان کس طرح نیک بن سکتا ہے۔

اب مَیں حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ایک بات پر اس لیکچر کو ختم کرتا ہوں وہ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ایسی بات ہے جس میں آپ نے دکھ کا اظہار کیا ہے اور بتایا ہے کہ اگر ہم نیک نہ بنیں تو ہماری غرض جو اس جماعت کے بنانے سے ہے وہ پوری نہیں ہو سکتی کیونکہ اس صورت میں ہماری جماعت خدا کے فضل کی وارث نہیں بن سکتی اس لئے کوشش کرنی چاہیئے کہ ہم ان اخلاق کو پیدا کریں جو حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ہمارے لئے ضروری قرار دئے ہیں۔ مَیں اُمید کرتا ہوں کہ وہ دوست جنہوں نے میرے اس سال کے لیکچروں کے نوٹ لئے ہیں اور جنہوں نے یہ لیکچر سُنے ہیں وہ عملی طور پر ان طریقوں کو استعمال کریں گے تا کہ ہم دنیا کو دکھا سکیں کہ ظاہری اعمال میں بھی ہماری جماعت کے برابر اور کوئی نہیں۔ سچ بات تو یہ ہے کہ اگر ہماری جماعت کا ہر ایک شخص اولیاء اللہ میں سے نہ ہو تو دنیا کو نجات نہیں دلائی جا سکتی اور ہم دنیا میں کوئی تغیر نہیں پیدا کر سکتے۔ یاد رکھو ہمارا مقابلہ دنیا کی موجودہ بدیوں سے ہی نہیں بلکہ ہمارا فرض خیالات بد کی رو سے مقابلہ کرنا بھی ہے۔ اور ہمیں خیالات کے اس دریا کا مقابلہ کرنا ہے جو ہر طرف لہریں مار رہا ہے۔ پس ہماری پوزیشن بہت ہی نازک ہے۔ مَیں احباب سے التجاء کرتا ہوں کہ احباب ایسا ہی بننے کی کوشش کریں۔ جیسا کہ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام ہمیں بنانا چاہتے ہیں۔ اب مَیں حضرت مسیح موعودؑ کی دُعا پر اس لیکچر کو ختم کرتا ہوں اور خود بھی اس دُعا میں شامل ہوتا ہوں۔

حضرت مسیح موعودؑ فرماتے ہیں:۔

''مَیں کیا کروں اور کہاں سے ایسے الفاظ لاؤں جو اس گروہ (یعنی جماعت احمدیہ) کے دلوں پر کارگر ہوں۔ خدایا مجھے ایسے الفاظ عطا فرما اور ایسی تقریریں الہام کر جو ان کے دلوں پر اپنا نور ڈالیں اور اپنی تریاقی خاصیت سے ان کے زہر کو دور کر دیں۔ میری جان اس شوق سے تڑپ رہی ہے کہ کبھی وہ دن ہو کہ اپنی جماعت میں بکثرت ایسے لوگ دیکھوں جنہوں نے درحقیقت جھوٹ چھوڑ دیا اور ایک سچا عہد اپنے خدا سے کر لیا کہ وہ ہر ایک شر سے اپنے تئیں بچائیں گے اور تکبر سے جو تمام شرارتوں کی جڑ ہے بالکل دور جا پڑیں گے اور اپنے رب سے ڈرتے رہیں گے۔''

''دُعا کرتا ہوں اور جب تک مجھ میں دمِ زندگی ہے کئے جاؤں گا اور دُعا یہی ہے کہ خدا تعالیٰ میری اس جماعت کے دلوں کو پاک کرے اور اپنا رحمت کا ہاتھ لمبا کر کے ان کے دل اپنی طرف پھیر دے اور تمام شرارتیں اور کینے ان کے دلوں سے اُٹھا دے۔ اور باہم سچی محبت عطا کر دے۔ اور مَیں یقین رکھتا ہوں کہ یہ دُعا قبول ہوگی اور خدا میری دعاؤں کو ضائع نہیں کریگا۔''

حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کی یہ دُعا قبول ہوگی اور خدا تعالیٰ اسے ضائع نہیں کرے گا۔ مگر تم سوچ لو تم اس کے مصداق بنو گے یا بعد میں آنے والے؟ اگر بعد میں آنے والوں کے حق میں قبول ہوگی تو پھر ہمیں کیا فائدہ؟ اس لئے مَیں کہتا ہوں حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کی دُعا کو مدنظر رکھ کر کوشش کرو کہ ہم ہی اس کے مصداق ہوں اور اس نظارہ سے ہمیں ٹھنڈک پہنچے جو حضرت مسیح موعودؑ نے کھینچا ہے۔

اس کے بعد مَیں دُعا کر کے جلسہ ختم کرتا ہوں اور جنہوں نے جانا ہے ان کو اجازت دیتا ہوں۔

بک ڈپو والے کہتے ہیں مَیں سفارش کروں کہ ان کی شائع کردہ کتابیں جو حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کی کتابیں ہیں احباب خریدیں۔ آپ لوگوں کا فرض ہے کہ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کی کتب کی اشاعت کریں۔ خود خریدیں اور پڑھیں اور ان کو دنیا میں پھیلائیں یعنی دوسروں تک پہنچانے کی کوشش کریں۔

الحمدللہ